بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

ہر دور کے کچھ مخصوص نعرے ہوتے ہیں جن کا چلن آہستہ آہستہ بڑھتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ وہ ہر شخص کی زبان پر رواں ہو جاتے ہیں اور ہر کس و ناکس بلا ادنیٰ غور و فکر انہی کے انداز میں سوچنے اور انہی کی زبان میں بولنے لگتا ہے۔ ان نعروں کا رواج عام عقل و فہم کی موت کے مترادف ہے۔ جب یہ ذہنوں پر چھا جاتے ہیں تو آزادیٔ فکر باقی نہیں رہتی۔ عامی اور عالم، ان پڑھ اور پڑھے لکھے، سب انہی کا سہارا لینے لگتے ہیں اور سمجھ بوجھ کی صلاحیتیں اِس آکاس بیل کے تحت مرجھا جاتی ہیں۔

ہمارے دور میں بھی کچھ خاص نعرے ہیں جو رواجِ عام اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں نعرہ ہے "با زمانہ بساز"۔ آئے دن یہ بات بڑے زور شور سے دہرائی جا رہی ہے کہ:

> "زمانہ بدل چکا ہے۔ مذہب کو زمانے کی تبدیلیوں کا ساتھ دیتے ہوئے نئے حالات کے مطابق بدلنا چاہیے۔ اگر مذہب دورِ حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ کیا گیا تو اس کے خلاف بغاوت ہوگی اور وہ زندگی سے بے دخل ہو جائے گا۔ جمود کا نتیجہ موت ہے۔ ہم کو زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ بدلنا ہوگا۔ ورنہ موت کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔"

آج جسے دیکھو وہ کسی نہ کسی عنوان سے یہی درس دیتا نظر آتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس نعرے پر "ایمان بالغیب" لانے کے بجائے اس کے تمام پہلوؤں پر عقل و تجربے کی روشنی میں غور کیا جائے اور محض اس لیے کسی بات کو قبول کرنے کی غلطی نہ کی جائے کہ اس کا

اظہار تنکرار ہو رہا ہے۔

اس امر میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ زمانہ ہمیشہ بدلتا رہا ہے، بہت کچھ بدل چکا ہے۔ مزید رنگ بدلے گا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جمود ایک مصیبت ہے جو قوم کی تخلیقی قوتوں کو یخ بستہ کر دیتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہر تبدیلی صحت مند ہے؟ کیا ہر تغیر باعث خیر ہے؟ کیا تاریخ کا ہر قدم عروج ہی کی طرف اٹھتا ہے؟ اور کیا ہر حرکت بلندی ہی کی سمت جاتی ہے؟

ان سوالات پر جب آپ تاریخ کی روشنی میں غور کریں گے تو لازماً اس نتیجہ پر پہنچیں کہ ان کا جواب نفی میں ہے۔ ہر حرکت ترقی کے مترادف نہیں۔ ایک نوع کی حرکت اگر آپ کو ثریا کی بلندیوں تک لے جا سکتی ہے تو ایک دوسری قسم کی حرکت تحت الثریٰ کی پستیوں تک لے اترتی ہے۔ مطلوب نفس حرکت نہیں بلکہ صحیح سمت میں حرکت ہے۔

ترقی ایک اضافی اصطلاح ہے۔ ترقی اور تنزل کا فیصلہ منزل کے لحاظ ہی سے ہو سکتا ہے۔ ہم صرف اسی حرکت کو ترقی کہہ سکتے ہیں جو صحیح راستہ سے ہمیں اپنی منزل کی طرف لے جا رہی ہو۔ جو حرکت منزل کے برعکس سمت میں لے جائے وہ ترقی نہیں بلکہ تنزل ہے۔

اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ حرکت سے پہلے سمت حرکت اور منزل مقصود کا تعین ہونا چاہیے ورنہ محض جمود کو توڑنے کے شوق میں کوئی حرکت کر کے آپ اپنی منزل سے اور دور بھی ہٹ سکتے ہیں۔ تمدنی اور تہذیبی زندگی میں اصل معیار وہ مقصد ہوتا ہے جو آپ حاصل کرنا چاہیں۔ اگر آپ کا مقصد اور آپ کی منزل اسلام ہے تو پھر ہر وہ حرکت جو اس کی مخالف سمت میں لے جائے، خواہ وہ کتنی ہی سبک خرام کیوں نہ ہو، ترقی معکوس ہوگی۔ بلکہ یہ حرکت جتنی تیز ہو، تنزل اتنا ہی تیز رفتار ہوگا۔

اسی طرح اندھی تقلید اور کورانہ نقالی صرف ماضی ہی کی نہیں ہوتی۔ حال کے مروجہ

طریقوں اور ضابطوں کی بھی ہو سکتی ہے۔ اور کسی فرد یا قوم کی خودی اور اس کے صحت مندانہ ارتقاء کے لیے جتنی مہلک ماضی کے بتوں کی اندھی پرستش ہے اتنی ہی مہلک نئے بتوں کی پوجا بھی ہے۔ بلکہ اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو نقالی دراصل جمود ہی کی ایک شکل ہے۔ اگرچہ ہے بڑی پُر فریب۔ عقل و فکر کو دونوں ہی صورتوں میں معطل کر دیا جاتا ہے۔ جمود میں آپ ماضی کی پرستش کرتے ہیں اور لکیر کے فقیر بنے رہتے ہیں تو نقالی میں آپ ماضی کے بجائے کسی نئے سورج کی پرستش شروع کر دیتے ہیں۔ آپ کی اپنی خودی کے لیے دونوں تباہ کن ہیں۔

جو لوگ زمانے کے چلن کی پیروی کا بلاوا دیتے ہیں وہ بھول جاتے ہیں کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ دراصل دوسروں کی تقلید ہی کی دعوت دے رہے ہیں۔ اور تقلید اگر جدید کی کی جائے تو وہ کوئی فخر کے قابل چیز نہیں بن جاتی۔ اُس کے نقصانات علیٰ حالہٖ قائم رہتے ہیں جن کی بناء پر قوم کی اپنی تخلیقی صلاحیتیں کبھی اُبھرنے نہیں پاتیں۔ اس کی وجہ سے انسان کی روح میں جمود اور احساسِ کمتری پیوست ہو جاتا ہے۔ پوری قوم زمانے کو بدلنے کے بجائے بس خود اپنے ہی آپ کو بدلنے میں لگی رہتی ہے اور دوسروں کی شاگردی کے مقام سے آگے بڑھنا کبھی اسے نصیب نہیں ہوتا۔

پھر زمانے کی تبدیلی کا ڈھنڈورا پیٹنے والے اس امر کو بھی ملحوظ نہیں رکھتے کہ زمانہ تو بدلنے ہی کے لیے بنا ہے۔ آج وہ ایک خاص سمت میں تبدیل ہوتا ہے تو کل کسی دوسری سمت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ چڑھتے سورج کی پوجا کرنے والے ہمیشہ اپنے ہی دور کی غالب تہذیب کو ترقی کا کمال سمجھتے رہے ہیں۔ لیکن چشمِ تاریخ نے اس امر کا بارہا مشاہدہ کیا ہے کہ بڑی سے بڑی طاقتور تہذیب بھی ایک دن زوال کی نذر ہو جاتی ہے۔ یونانی تہذیب کے غلبہ کے زمانے میں یونانیت زدہ لوگ اسی کو تہذیب انسانی کا حرفِ آخر

سمجھتے تھے اور اس سے انحراف و اختلاف کو دیوانگی، پریشان خیالی اور کفر خیال کرتے تھے۔ لیکن ایک دن اس تہذیب کی اینٹ سے اینٹ بج گئی اور اب اس کی حیثیت آثارِ قدیمہ کی سی ہے۔ روم کے دورِ عروج میں یہی مقام رومی تہذیب کو حاصل ہوا لیکن بالآخر اس تہذیب کے بھی پرخچے اڑ گئے، اور آج اس کے آثار بالائے زمین نہیں بلکہ زیرِ زمین ڈھونڈے جا رہے ہیں! ایرانی تہذیب کی قسمت بھی اس سے مختلف نہ ہوئی اور یہی کچھ ان ۲۶ تہذیبوں کے ساتھ ہوا جو اپنے اپنے زمانہ میں غالب اور ناقابلِ تسخیر سمجھی جاتی تھیں۔ اگر ماضی کی تمام غالب تہذیبیں قابلِ تسخیر ثابت ہوئیں اور ایک دن کامیاب وہی لوگ ہوتے جو ان کی نقالی نہیں کرتے تھے بلکہ ان کی جگہ ایک دوسرا نظام پیش کرتے تھے تو مستقبل کے متعلق یہ کیوں تصور کر لیا جاتا ہے کہ جدید مغربی تہذیب کو ـــ باوجود اس کے موجودہ غلبہ کے ـــ مسخر نہیں کیا جا سکتا؟

محض یہ چیز کہ آج ایک خاص تہذیب کو غلبہ حاصل ہے اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ یہی تہذیب مبنی برحق بھی ہے۔ نہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اسی کو ہمیشہ قائم رہنا ہے اور نوعِ انسانی کے لیے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اپنے آپ کو اسی کے مطابق ڈھال لے۔ طاقت اور غلبہ حق کے معیارات کو تبدیل نہیں کر دیتے اور اقتدار کسی چیز کو محاسن کا پیکر نہیں بنا دیتا۔ نہ ہر رائج شدہ چیز ناقابلِ تغیر اور ناقابلِ تسخیر ہوتی ہے۔ یہ کمزوروں کی سنت ہے کہ وہ طاقت کی پوجا کرتے ہیں اور ہر چڑھتے سورج کے آگے جھک جاتے ہیں۔ یہ کم نظروں کا طریقہ ہے کہ وہ محض اس بنا پر کسی مسلک کو اختیار کر لیتے ہیں کہ اسے اقتدار اور غلبہ حاصل ہے اور یہ نہیں دیکھتے کہ وہ کہاں تک صحیح ہے اور کہاں تک غلط۔ حالانکہ دیکھنے کی اصل چیز غلبہ اور طاقت نہیں بلکہ کسی چیز کا حق یا باطل ہونا ہے۔ اگر زمانہ بدل رہا ہے تو اس کو مزید بھی بدلا جا سکتا ہے۔ لیکن محض زمین و آسمان کی گردش اور ماہ و سال کی آمد و رفت کی وجہ سے زندگی کے اصول، حق و باطل کے معیار، اور خیر و شر کے

تعینات نہیں بدلے جاسکتے۔

جدید ذہن کی تعمیر جن عوامل نے کی ہے ان میں وہ فکر و فلسفہ بھی شامل ہے جو ہر نئی چیز کو خوب تر اور قابلِ احترام اور لائقِ اختیار سمجھتا ہے۔ مغرب کے ذہن کو ہیومنزم (HUMANISM) کے فلسفے نے بہت متاثر کیا ہے اور اس فلسفہ کی اساس تاریخ میں ناگزیر ترقی کا اصول (INEVITABILITY OF PROGRESS) ہے۔ اس کی رو سے ہر آنے والا دن گزرے ہوتے دن سے بہتر ہے۔ انسان کا ورثہ روز بروز بڑھ رہا ہے۔ حال ماضی سے اچھا ہے اور مستقبل حال سے بہتر ہوگا۔ ہمارے قدم لازماً ترقی اور عروج کی طرف اٹھ رہے ہیں اور اب پیچھے ہٹنے کا کوئی امکان نہیں۔ اس اصول کو ہیگل کے فلسفۂ تاریخ اور مارکس کی معاشی تعبیرِ تاریخ نے بڑی تقویت پہنچائی۔ یہ اسی اندازِ فکر کا نتیجہ ہے کہ ماضی کی ہر چیز کو کم مایہ اور حقیر اور حال کی ہر شے کو قابلِ قدر سمجھا جا رہا ہے اور ترقی کا لازمی تقاضا یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ تغیرِ زمانہ کے نام پر ہر قدیم چیز کو بدل ڈالا جائے۔

یہ نظریہ بدیہی طور پر غلط ہے۔ ہمیں انسانی تاریخ میں ارتقا کی کوئی سیدھی لکیر نظر نہیں آتی۔ یہ تاریخ بڑی کج رو واقع ہوئی ہے۔ اس میں ترقی بھی ہے اور تنزل بھی۔ عروج بھی ہے اور زوال بھی۔ ارتقا بھی ہے اور انحطاط بھی۔ فراز بھی ہے اور نشیب بھی۔ ہر بعد کے دَور کو پچھلے دَور سے بہتر سمجھنا تاریخی لحاظ سے بالکل ایک غلط مفروضہ ہے جسے ہرگز صحیح ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ جدید فلاسفۂ تاریخ میں سے کوئی ایک بھی ہیگل اور مارکس کی اس توجیہ کو صحیح نہیں سمجھتا اور تاریخی حقائق اس کی توثیق کرنے سے انکاری ہیں۔ مسلسل ارتقاء کا نظریہ آج علمی حیثیت سے ایک متروک نظریہ ہے۔ لیکن اس کے بطن سے جس فاسد تصور نے جنم لیا ہے وہ عام پڑھے لکھے لوگوں کے دماغ پر مسلط ہے اور وہ اپنی ترقی پسندی کا ڈھول پیٹنے کے لیے محض فیشن کے طور پر ہر قدیم چیز پر ناک بھوں چڑھاتے اور ہر نئی چیز کی طرف بے سوچے سمجھے لپک

پڑتے ہیں۔ حالانکہ قدیم کو لازماً بُرا اور جدید کو لازماً اچھا سمجھنا اور تمام قدیم چیزوں کو تبدیلی کے خراد پر چڑھا دینا ایک غلط روش ہے جس کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں۔

پھر سوال یہ بھی ہے کہ زمانہ کے تغیّر کی نوعیت کیا ہے؟ اور یہ تغیر زندگی کے کس دائرے میں واقع ہو رہا ہے۔

کائنات کا وہ دَور جو زمین پر انسان کی آمد سے شروع ہوا ہے اب تک جاری ہے۔ ارتقائے کائنات کے نقطۂ نظر سے اگر غور کیا جائے تو یہ امر صاف ظاہر ہے کہ یہ دَور اپنی چند متعین خصوصیات رکھتا ہے جو انسانی تہذیب کے سارے ہی مرحلوں میں نمایاں نظر آتی ہیں۔ ان خصوصیات میں کوئی اساسی تبدیلی اسی وقت واقع ہو گی جب یہ دَور ختم ہو جائے گا اور کوئی دوسرا دَور شروع ہو گا (مثلاً دَورِ آخرت)۔ اس پورے زمانے میں انسان کی فطرت، کائنات کے فطری قوانین، انسانی زندگی کے اساسی اصول، حیات و موت کے ضابطے، انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بنیادیں، ہدایت و ضلالت کے قواعد، یہ تمام ایک ہی رہے ہیں اور ایک ہی رہیں گے۔ افراد پیدا ہوتے ہیں اور مرتے ہیں۔ تہذیبیں ابھرتی ہیں اور معدوم ہو جاتی ہیں۔ سلطنتیں بنتی ہیں اور بگڑتی ہیں۔ لیکن فطرت کے قوانین غیر متبدل ہیں۔ زندگی کی اصل غیر متغیر ہے، اور اجتماع و تمدن کے اساسی ضابطے ثابت و مستحکم ہیں۔ ایک ہی اصول ہیں جو کار فرما ہیں، ایک ہی حقیقت ہے جو جلوہ گر ہے۔ تغیّر و تبدّل صرف ظاہری اور سطحی چیزوں میں ہے، بنیادی اور اساسی چیزوں میں نہیں۔ اس لیے یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ زندگی کے موجودہ دَور میں جو تغیرات بھی واقع ہو رہے ہیں وہ ایک محدود دائرے میں ہیں، بنیادوں میں نہیں صرف فروع میں ہیں، اور ان کی بنا پر قدیم و جدید کا جھگڑا بجز کوتاہ نظری کے اور کچھ نہیں۔ بقول اقبال ؎

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری، قصۂ قدیم و جدید!

ہم تغیر کے وجود کے منکر نہیں ہیں۔ یہ تو ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن ہی نہیں لیکن جس چیز کا سمجھنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اس تغیر کی نوعیت کیا ہے۔ اس لیے کہ اس کی نوعیت کو سمجھے بغیر کوئی صحت مند اجتماعی پالیسی اختیار نہیں کی جا سکتی۔

انسان کی اجتماعی زندگی میں جو تبدیلی بھی آرہی ہے وہ ذرائع اور وسائل کی دنیا میں ہے۔ مقاصد اور اصول و اخلاق کی دنیا میں نہیں۔ فنی ایجادات اور تکنیکی انکشافات انسان کے وسائل اور فطری قوتوں پر اس کے اختیار کو برابر بڑھا رہے ہیں۔ زمان و مکان کی رکاوٹیں دُور ہو رہی ہیں اور انسان کا اقتدار بڑھ رہا ہے لیکن یہ ساری تبدیلی ذرائع و وسائل ہی کی حد تک ہو رہی ہے۔ اس تبدیلی کا یہ تقاضا ہرگز نہیں کہ مقاصد زندگی، اصول اخلاق اور اقدار حیات کو بھی تبدیل کر دیا جائے۔ اگر ہوائی جہاز، جیٹ اور راکٹ کے استعمال سے زمین کی طنابیں کھنچ گئی ہیں تو اس کے یہ معنی کب ہیں کہ زنا جو کل تک حرام تھی آج حلال ہو جائے؟ اگر برقی قوت کے ذریعہ انسان کے پاس وہ طاقتیں آگئی ہیں جو پہلے صرف جنوں اور فرشتوں کو حاصل تھیں تو اس کا آخر کیا اثر خیر و شر کے اصولوں کی صداقت پر پڑتا ہے؟ میزائل اور اسپوتنک کے استعمال کا آخر یہ تقاضا کب ہے کہ جھوٹ، سُود، سٹہ، شراب اور دوسرے منکرات کو جائز قرار دے دیا جائے؟ صنعتی ترقی کا آخر یہ تقاضا کب ہے کہ اصولِ انصاف کو بھی بدل دیا جائے؟

جو حضرات سطحی نظر رکھتے ہیں وہی اس قسم کی باتیں کرتے ہیں کہ یہ تغیرات اصولوں میں ردّ و بدل کے متقضی ہیں۔ درحقیقت تمام ایجادات و انکشافات انسان کے لیے ہیں انسان ان کے لیے نہیں۔ تمام مادی ترقیات اسی وقت مفید ہو سکتی ہیں جب وہ انسان کی بھلائی کے لیے استعمال ہوں، خود بھلائی اور برائی کے اصول ان کی خاطر نہ بدل جائیں۔ یہ قوتیں جو انسان کو حاصل ہوئی ہیں اُسی وقت نافع ہیں جب وہ اعلیٰ مقاصد حیات کی تابع ہوں، اپنے ریلے میں انہیں بہا کر نہ لے جائیں۔ مقاصد و اصول کو ان کے مطابق نہیں بلکہ ان کو مقاصد و اصول

کے مطابق بدلنا چاہیے۔ مقاصد اور اصولوں کی حیثیت تو اُن معیارات کی ہے جن سے تکنیکی ترقیات کے حسن و قبح کو ناپا جائے گا۔ اگر ان ترقیات کے باوجود انسان ہی پریشان و مضطرب رہتا ہے تو پھر ساری مادی ترقی بے کار ہے ؎

نہ کلی ہے وجہ نظر کشی، نہ کنول کے پھول میں تازگی
فقط ایک دل کی شگفتگی، سببِ نشاطِ بہار ہے

انسانی زندگی میں تغیر کا منہاج کچھ ایسا ہے کہ تبدیلی کے ساتھ ساتھ ثبات اور دوام کا بھی ایک پہلو موجود ہے۔ تبدیلی ہر لحظہ آتی ہے لیکن بنیادی حقیقت کو متاثر کیے بغیر اپنا ظہور کرتی رہتی ہے۔ مثلاً انسان کے جسم اور اس کی ذات کو لیجیے۔ سائنس کے مشاہدات ہمیں بتاتے ہیں کہ انسان کے نظام جسمانی میں ہر لحظہ تغیرات ہو رہے ہیں۔ ایک بچے کے جسم کا ایک ایک ریشہ جوان ہونے تک بدل جاتا ہے۔ اس کے بعد بھی یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک خاص مدت میں ہر مرتبہ انسان کا جسم اپنے کو بالکل تبدیل کر کے ایک نیا جسم بن جاتا ہے لیکن اس تبدیلی میں بنیادی نظام وہی رہتا ہے اور ہر شخص کی اساسی شخصیت اس کی "انا" غیر متبدل رہتی ہے۔ اسی کیفیت کو نکولائی بردائیف (NICOLI BERDYVE) ان الفاظ سے تعبیر کرتا ہے کہ "انسانی ذات، تغیرات کے جلو میں عدم تغیر کا نام ہے" (PERSONALITY IS CHANGELESSNESS IN CHANGE)۔ اور برگسان نے اس بات کو یوں ادا کیا ہے کہ "ہم میں تغیر تو آتا ہے لیکن ہماری بنیادی حقیقت معدوم نہیں ہوتی"۔

اسی طرح درختوں کو دیکھیے۔ ایک درخت ایک خاص مدت میں اپنے پھول پتے بالکل تبدیل کر لیتا ہے۔ اس کی زندگی میں تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں لیکن یہ تبدیلی اس کی اصل کو نہیں بدلتی بلکہ اس سے ہم آہنگ رہتی ہے۔ ایک بنیادی رنگ ہے جو بہر صورت غالب رہتا ہے اور یہی اس کی انفرادیت ہے ؎

صبح بہار آئی ہے لیکر، رُت بھی نئی، شاخیں بھی نئی
غنچۂ و گُل کے رُخ پر لیکن رنگِ قدامت آج بھی ہے

یہ فطرت کا قانون ہے جو ہر شعبۂ زندگی میں جاری و ساری ہے۔ انسان کی اجتماعی اور تہذیبی زندگی میں بھی ہمیں یہی جلوہ گر نظر آتا ہے۔ اسی بنیاد پر علّامہ اقبال نے کہا تھا کہ

"ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ زندگی محض تغیّر ہی نہیں، اس میں حفظ و ثبات کا ایک عنصر بھی موجود ہے . . . لہٰذا اس ہر لحظہ آگے ہی آگے بڑھنے والی حرکت میں انسان اپنے ماضی کو نظر انداز نہیں کر سکتا . . . اسی بات کو ہم دوسرے لفظوں میں یوں ادا کریں گے کہ زندگی چونکہ ماضی کا بوجھ اٹھائے آگے بڑھتی ہے اس لیے ہمیں چاہیے کہ جماعت میں تغیر و تبدل کا جو نقشہ بھی ہم نے قائم کیا ہو اس میں قدامت پسندانہ قوتوں کی قدر و قیمت اور وظائف کو فراموش نہ کریں"۔ (خطبات صفحہ ۲۵۷، ترجمہ نذیر نیازی)

مندرجہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ:

— ہر تبدیلی موجبِ خیر ہی نہیں ہوتی ہے۔ جو چیز مطلوب ہے وہ محض تبدیلی نہیں بلکہ صحیح سمت میں تبدیلی ہے۔

— محض زمانہ کے چلن کا اتباع کسی فرد یا قوم کے لیے فلاح کا باعث نہیں ہو سکتا۔

— کسی چیز کے غالب ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ لازماً اچھی اور صحیح بھی ہے۔ یا یہ کہ وہ ناقابلِ تغیر ہے۔

— ناگزیر ترقی کا اصول ایک فاسد اصول ہے جس کی تائید تاریخ سے نہیں ہوتی۔

— زمانہ کے تغیّر کی نوعیت بڑی غور طلب ہے۔ تبدیلی کا دائرہ بڑا محدود ہے۔ تبدیلی بنیادوں میں نہیں، صرف فروع اور ظواہر میں ہوتی ہے۔ انسانی فطرت، کائنات

کے بنیادی قوانین اور ہدایت وضلالت کے ضابطہ میں کسی تغیر کا سوال نہیں۔

—— زندگی صرف تغیر کا نام نہیں بلکہ وہ تغیر اور ثبات دونوں کے توازن سے قائم ہے اور صحت مند نظام وہی ہو سکتا ہے جو دونوں پہلوؤں میں کامل توازن قائم کرے۔

ان امور کے متحقق ہو جانے کے بعد اب مسئلہ کی مزید تنقیح ہمارے لیے بہت آسان ہو جاتی ہے۔

اسلام خدا کی اس ہدایت کا نام ہے جو اس نے اپنے برگزیدہ نبیوں کے ذریعے انسان کی رہنمائی کے لیے وقتاً فوقتاً بھیجی ہے اور جو اپنی آخری اور مکمل شکل میں ہم کو محمد رسول اللہ صلی اللہ وسلم کے ذریعہ سے پہنچی ہے۔ یہ وہ ضابطۂ حیات ہے جو عین فطرت کے اصولوں پر قائم ہے اور انسان اسی کے ذریعہ سے دنیاوی اور اُخروی دونوں کامیابیاں حاصل کر سکتا ہے۔ یہ زندگی کا مکمل قانون ہے۔ اس قانون کو انسان نے نہیں خدا نے بنایا ہے۔ یہ ابدالآباد تک کے لیے ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔

لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ۔ (یونس۔ ۶۴) — خدا کی باتیں (یعنی اس کے احکام و فرامین) بدلے نہیں جا سکتے۔

وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (الانعام ۳۴) — اور خدا کی باتوں کو بدل دینے والا کوئی نہیں

لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ۔ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (الروم۔ ۳۰) — خدا کی بنائی ہوئی ساخت میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (فاطر ۴۳) — اور تم خدا کے طریقے میں تبدیلی نہ پاؤ گے

قرآن پاک کی یہ آیات بالکل صاف اور واضح ہیں اور اس امر کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ خدا کا دین، اس کے احکام اور قوانین ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہیں اور محض زمانے

کی تبدیلی کی وجہ سے ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ تبدیلی زمانے میں کرنی ہو گی، خدا کے قانون میں نہیں۔ مردود وہ ہیں جو ؎

خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں

یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا میں بدعت شروع کرنے والے اور بدعتی کی تعریف کرنے والے پر خدا کی لعنت ہو۔

اگر اس مسئلہ پر عقلِ سلیم کی روشنی میں غور کیا جائے تو فکر و نظر کا ہر گوشہ اس بات پر گواہی دیتا ہے کہ خدا کے قانون میں کسی تبدیلی کی نہ ضرورت ہے اور نہ گنجائش۔ اور اس کی وجہ بھی بہت واضح ہے۔ زمانے کی تبدیلی کا اثر اُس قانون اور اصول پر پڑتا ہے جسے انسان نے بنایا ہو۔ انسانی فکر زمان و مکان کی حدود میں مقید ہے۔ وہ ماضی، حال اور مستقبل کے تمام حقائق سے واقف نہیں۔ وہ ایک محدود بصیرت کے ساتھ آج ایک چیز کو صحیح سمجھ کر پیش کرتی ہے مگر کل جب وہ حالات سامنے آتے ہیں جن کا کوئی تصور پہلے موجود نہ تھا، تو وہ غلط ثابت ہو جاتی ہے۔ لیکن خدا ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا اس کا علم ہر شے پر محیط ہے۔ زمان و مکان کی قیود اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ جو قانون ایسے خدا کی طرف سے ہو اس کا کسی ایک مخصوص زمانے کے ساتھ محدود ہو جانا کیسے ممکن ہے۔ خدا کے علم اور خدا کے دیئے ہوئے قانون کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ کبھی از کار رفتہ ہو جائے۔ وہ تو ہمیشہ اتنا ہی تازہ رہے گا جتنی صبحِ نو!

ثانیاً، خدا کا یہ قانون بنیادی طور پر ہدایت و ضلالت کی حقیقت کو واضح کرتا ہے اور اُن اصولوں اور اُن اقدار کو بیان کرتا ہے جن پر وقت کے تغیرات، تہذیبوں کے عروج و زوال اور ماہ و سال کی آمد و رفت کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ فطرت کے اصولوں کو بیان کرتا ہے اور فطرت کا قانون قائم و مستحکم ہے۔

ثالثاً، قرآن و سنت اصولی رہنمائی دیتے ہیں، انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بنیادیں فراہم کرتے ہیں اور ان اساسی اداروں کو قائم کرتے ہیں جنہیں ہر زمانے میں قائم رہنا چاہیے۔ ان چیزوں پر زمان و مکان کے تغیر کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ اصول غیر متبدل ہیں اور ان میں تبدیلی فطرت کے قانون کے خلاف ہو گی۔

ان وجوہ کی بنا پر زمانے کی تبدیلی کے مطابق اسلام کے تبدیل کیے جانے کا قطعاً کوئی امکان نہیں۔

یہی چیز ہے جو انبیاء و صلحاء کی سنت کے مطالعہ سے معلوم ہوتی ہے۔ ہر نبی ایسے حالات میں مبعوث ہوا جب زمانہ کا بگاڑ اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا اور زندگی کا دریا بالکل غلط رخ پر رواں دواں تھا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ کسی بھی نبی نے زمانے کے چلن کے مطابق اسلام کو تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ زمانہ کے رنگ سے متاثر نہ ہوئے بلکہ زمانے کو اپنے رنگ میں رنگنے کی سعی میں مصروف ہو گئے اور بالآخر اس پر صبغۃ اللہ کو غالب کر دیا۔ قرآن میں اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ یوں بیان فرماتا ہے:

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ	وہ خدا ہی ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت
بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى	اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے تمام
الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۔	دینوں پر غالب کر دے، خواہ مشرکوں کو
(الصف۔ ۹)	کیسا ہی ناگوار ہو۔

ہدایت اور دین حق ہیں ہی اس لیے کہ انبیاء ان کو دنیا کے باقی تمام نظاموں اور طریقوں پر غالب کریں۔ خدا کا دین اس لیے نہیں ہے کہ اسے زمانہ کے چلن کے مطابق بدلا جاتے بلکہ اس لیے ہے کہ زمانے کو اس کے مطابق بدلا جائے اور اس کو غلبہ و اختیار کا مقام حاصل ہو۔ مشرکوں، کافروں اور منافقوں کی تو دلی تمنا ہی یہ ہوتی

ہے کہ دین کو ان کے منشاء کے مطابق بدلا جاتے لیکن خدا اس بات کو صاف کر دیتا ہے کہ ان کی ناخوشی کا ہرگز کوئی خیال نہیں کیا جا سکتا۔ سربلندی دین کو حاصل ہونی چاہیے اور زمانہ پر اس کی حکمرانی قائم ہونی چاہیے۔

انبیاء کی سیرت اسی حقیقت پر شاہد ہے۔ حضرت نوح کی قوم بغاوت پر تلی رہی۔ آپ نے ساڑھے نو سو سال تک دین حق کی دعوت دی لیکن ایک دن کے لیے بھی وہ "وقت کے تقاضوں" کے مطابق دین کو تبدیل کرنے پر راضی نہ ہوتے۔ ان کی دعوت یہی رہی کہ

یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰہٍ غَیۡرُہٗ۔ — اسے میری قوم! خدا کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔

ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے زمانے کی تہذیب کے کئی بڑے مراکز پر دعوتِ حق دی لیکن کہیں بھی زمانے کے تقاضوں کے مطابق دین کو نہیں ڈھالا۔ انہوں نے آگ اور جلاوطنی کے مصائب کو انگیز کیا لیکن دین پر حرف نہ آنے دیا۔ حضرت لوطؑ کی قوم شدید قسم کی اخلاقی برائیوں میں مبتلا تھی مگر آپ نے زمانے کے چلن کو دیکھ کر دین میں ترمیم نہیں کی بلکہ زمانے کے خلاف بغاوت کی۔ حضرت ہودؑ نے اپنی قوم کے طور طریقوں کو اختیار کرنے کی بجائے اسے خدا کے غیر متبدل قانون کی پیروی کے لیے پکارا۔ حضرت صالحؑ نے اپنی قوم کی سرکشی کے لیے کوئی الاؤنس نہ دیا اور انہیں خوش کرنے کے لیے دین میں کسی کمی بیشی کو گوارا نہ کیا۔ حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم کی معاشی "ترقی" کی خاطر ان کے ظالمانہ معاشی نظام کو قبول کر کے دین میں ترمیمات نہ کیں بلکہ ان کو کامل اطاعت کی دعوت دی۔ تمام انبیاء کی سنت یہی رہی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مشرق سے مغرب تک جو نظام چل رہا تھا اسے قبول کرنے اور اس کے مطابق اپنے آپ کو اور اپنے دین کو ڈھالنے کی بجائے آپ نے اسے ایک فاسد نظام قرار دیا۔ ظَھَرَ الۡفَسَادُ فِی الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ

(خشکی اور تری میں فساد پھیل گیا ہے) لیکن خدا کے نبی نے زمانے کے تقاضوں سے COMPROMISE اور اس کے ساتھ مصالحت کرنے کے بجائے اس کی ہر ہر خرابی کے خلاف جنگ لڑی ۔ زمانے کے آگے جھکنے کا مشورہ دینے والوں کو آپ کا صاف جواب یہ تھا کہ :

واللہ! لو وضعوا الشمس فی یمینی والقمر فی یساری علیٰ ان اترک ھٰذا الامر ما ترکتہ حتیٰ یظھرہ اللہ او اھلک فیہ ۔

خدا کی قسم ! اگر یہ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ کر کہیں کہ میں اس کے عوض میں اس دعوت کو ترک کر دوں تو میں ہرگز اسے ترک نہ کروں گا یہاں تک کہ یا تو اللہ اس دعوت کو کامیاب فرما دے یا میں اس راہ میں جان دے دوں ۔

انبیاء کا طریقہ یہ نہیں رہا کہ وہ زمانے کے آگے جھکیں اور لوگوں کو راضی کرنے کے لیے خدا کے دین کو بدلیں ۔ وہ حق کے پیغامبر ہوتے ہیں اور زمانے کی رو کے خلاف اپنی دعوت پیش کر کے اسے تبدیل کرنے کی جدوجہد کرتے ہیں ۔ اگر وہی زمانے سے مطابقت اختیار کر لیں تو پھر انسانیت کی فلاح و اصلاح کا کوئی امکان باقی نہ رہے ۔

اِس اسوۂ انبیاء کے اتّباع کی بہترین مثال ہمیں حضرت ابوبکرؓ کی زندگی میں نظر آتی ہے ۔ حضور اکرمؐ کی وفات کے بعد یکایک عرب کا نقشہ پلٹ گیا ۔ ہر طرف سے بغاوتوں نے سر اٹھایا ۔ نئے نئے نبی اٹھ کھڑے ہوتے ۔ بہت سے قبائل نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا ۔ صحابہ کبار تک اس صورتِ حال پر پریشان ہو گئے اور لوگ یہ رائے پیش کرنے لگے کہ مصلحتِ وقت کی خاطر قبائل کے ساتھ نرمی برتی جائے اور وقت کے تقاضوں کا لحاظ کیا جائے ۔ مگر صدیقِ اکبرؓ کا جواب یہ تھا کہ

"واللہ! مجھ پر یہ فرض ہے کہ جو کام میں رسول اللہ کو کرتے دیکھ چکا ہوں خود

بھی وہی کروں اور اس سے سرِمو انحراف نہ کروں۔ اگر جنگل کے کتے اور بھیڑیئے مدینہ میں داخل ہو کر مجھے اٹھا لے جائیں تو بھی میں وہ کام کرنے سے باز نہ آؤنگا جسے رسول اللہ نے کرنے کا حکم دیا ہے"

"واللہ! اگر مانعینِ زکوٰۃ اونٹ باندھنے کی ایک رسّی دینے سے بھی انکار کریں گے جسے وہ رسول اللہ کے زمانے میں ادا کرتے تھے، تو بھی میں ان سے جنگ کرونگا۔ خدا کی قسم! میں زکوٰۃ اور صلوٰۃ میں فرق کرنے والے لوگوں سے ضرور لڑوں گا"

اسلام عبارت ہی نبی کی سنت کی پیروی سے ہے۔ اگر زمانے کی سنّت نبی کی سنّت سے متعارض ہے تو وہ شخص اپنے دعوائے ایمان میں جھوٹا ہے جو نبی کی سنت کو چھوڑ کر زمانے کی سنت کا اتباع کرے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ خدا کا دین ثابت و محکم ہے اور محض زمانے کے انداز دیکھ کر اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ لیکن یہ خیال کرنا بھی غلط ہوگا کہ زمانے کے تغیرات کو دین اسلام کلّی طور پر نظر انداز کرتا ہے۔ اسلام کا طریقِ کار یہ ہے کہ وہ ہدایت و ضلالت کے بنیادی اصول بتا دیتا ہے اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے لیے وہ حدود واضح کر دیتا ہے جو انسان کو صراطِ مستقیم پر قائم رکھنے کے لیے درکار ہیں۔ رہے جزوی اور وقتی امور تو ان کو شریعت کے دیئے ہوئے بنیادی اصولوں کی روشنی میں اور اس کے مقرر کیے ہوئے حدود کے اندر ہر وقت اور ہر زمانے میں طے کرنے کی اجازت ہے۔ یہ کام اجتہاد کے ذریعہ انجام پاتا ہے اور اسی کے ذریعہ نظامِ دین میں حرکت و ارتقاء کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے۔

زمانے کے تغیرات پر دو قسم کے ردِّ عمل (RESPONSE) اسلامی تاریخ میں نظر آتے ہیں۔ ایک کا نام "تجدید" ہے اور دوسرے کا "تجدّد"۔

تجدید یہ ہے کہ زمانے کے تغیرات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اصل دین کو بلاکم و کاست پیش کیا جائے اور اپنے دور اور اپنے زمانے کی زبان میں محکم استدلال کے ساتھ پیش کیا جائے۔ نیز تدبر و اجتہاد کے ذریعہ دین کو اپنے دور کے حالات پر نافذ کرنے کی عملی جدوجہد کی جائے۔ اُن تمام ذرائع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے جو قدرت نے انسان کو فراہم کیے ہیں۔ اور اسلامی بصیرت کے ساتھ نئے پیش آمدہ مسائل کو قرآن و سنت کی روشنی میں طے کیا جائے۔ تجدید کے ذریعہ ہر زمانے میں دین کی تعلیمات اور زندگی کے بہاؤ کے درمیان تعلق اور رابطہ گہرا ہوتا جاتا ہے اور زندگی کا دریا اسلام کی شاہراہ سے ہٹ کر چلنے نہیں پاتا۔ یہاں مخلصانہ اجتہاد کے ذریعہ نئے مسائل اور نئی مشکلات کو حل کیا جاتا ہے اور دین اپنے رنگ پر قائم رہتا ہے۔

تجدد اس کے مقابلہ میں وہ کوشش ہے جو زمانے کے تقاضوں کے نام پر خود دین کو بدل ڈالنے کے لیے کی جاتی ہے۔ زندگی اور زمانے کے درمیان ربط اس طریقے سے بھی قائم ہو جاتا ہے لیکن یہ ربط اسلام کی سرزمین پر نہیں غیر اسلام کی سرزمین پر قائم ہوتا ہے۔ اس میں اسلام کو اصل قرار دے کر حالات کو اس کے مطابق ڈھالنے کے بجائے زمانے کی چلتی ہوئی تہذیب کو اصل مان کر اُس کے پیدا کیے ہوئے حالات پر اسلام کو ڈھال دیا جاتا ہے۔ اس طریق کار کو اگر مسلمان ہر زمانے میں اختیار کرتے چلے جائیں تو اسلام کی کوئی چیز بھی اپنی جگہ پر باقی نہیں رہ سکتی، بلکہ اسلام سرے سے کسی متعین مذہب و مسلک اور نظریہ و نظام کا نام ہی نہیں رہتا۔

اسلام میں تجدید کے دروازے ہمیشہ کھلے رہے ہیں اور پوری تاریخ میں اسلام کے سچے خادم یہ کارنامہ انجام دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن تجدد کی اس میں کوئی گنجائش نہیں۔ ماضی میں جب بھی تجدد نے سر اٹھایا ہے مسلمانوں نے سختی کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا ہے اور ہر ایسی تخریبی کوشش ملت کی رائے عام سے ٹکرا کر آخر کار ختم ہو گئی ہے۔

آج بھی بنیادی کشمکش تجدید اور تجددِ دینی کے درمیان ہے۔ اور ہماری پوری تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ دین کو متجددین کی خاطر نہ کبھی ماضی میں بدلا گیا ہے اور نہ آج بدلا جاسکتا ہے۔ کسی مصطفےٰ کمال، کسی جمال ناصر، کسی جنرل گرسل یا کسی اور حکمران یا صاحبِ اثر شخصیت کی یہ طاقت نہیں ہے کہ زمانے کے تقاضوں کا نام لے کر اسلام کو بدل سکے۔ اس معاملے میں جو انجام "اکبر اعظم" کی کوششوں کا ہوچکا ہے وہی انجام اِن نئے متجددین کے لیے بھی مقدر ہے۔ دین میں مسخ و تحریف کی کوئی تدبیر اگر طاقت کے بل پر زبردستی نافذ کر بھی دی جائے تو اسے مسلمانوں کے اجتماعی ضمیر نے نہ ماضی میں کبھی قبول کیا ہے اور نہ آج قبول کر سکتا ہے۔ اس دین کی حفاظت کی ذمہ داری خدا نے لی ہے اور اُس نے ایسے ذرائع بھی پیدا کر دیتے ہیں کہ اس کی حفاظت ہوتی رہے۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ۔

آخر میں ایک بات کی طرف ہم اور اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔ پوری انسانی تاریخ اس امر پر گواہ ہے کہ ہمیشہ عظیم کارنامے انہی لوگوں نے انجام دیئے ہیں جو حالات کی رو پر بہنے کے بجائے ان کا مقابلہ کرنے اٹھے ہیں۔ زندگی پر امٹ نقوش انہوں نے نہیں چھوڑے جو مرغ بادِ نما کی طرح ہوا کے رُخ پر مڑتے اور دوسروں کی نقالی کرتے رہے بلکہ ان لوگوں نے چھوڑے ہیں جو ہوا کے رُخ سے لڑے ہیں اور زندگی کے دھارے کو موڑ کر رکھ دیا ہے۔ بڑے کام مکھی پر مکھی مارنے والوں نے نہیں کیے، اپنی راہ آپ نکالنے والوں نے کیے ہیں۔ بہادر وہ نہیں ہے جو دوسرے کے مارے ہوئے شکار کو کھاتا ہے، بہادر وہ ہے جو اپنا شکار خود کرتا ہے۔ قابلِ تقلید وہ نہیں ہے جو گرگٹ کی طرح صبح و شام رنگ بدلتا ہے بلکہ وہ ہے جو خود اپنا کوئی رنگ رکھتا ہے اور دنیا کو اپنے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔ مسلمان دنیا میں زمانے کے پیچھے

چلنے کے لیے پیدا نہیں کیے گئے ہیں۔ وہ تو پوری انسانیت کی طرف اس لیے بھیجے گئے ہیں کہ جسے خدا نیکی کہتا ہے اس کا حکم دیں، جسے خدا بدی کہتا ہے اسے مٹائیں اور دنیا میں خدا کی اطاعت کی روش کو عام کر دیں۔ وہ دوسروں کے رنگ میں رنگے جانے کے لیے نہیں ہیں، دوسروں کو اپنے رنگ میں رنگنے کے لیے ہیں:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ	تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے برپا کیے
تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ	گئے ہو تاکہ نیکی کا حکم دو، برائی سے روکو اور
وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ - (آل عمران - ۱۱۰)	اللہ پر ایمان لاؤ۔

یہ ہے مسلمانوں کا اصل مقام ـــ مگر انہیں ڈالا کس راہ پر جا رہا ہے ؟ بقولِ اقبال ؎

کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

درحقیقت مسلمان کے لیے اس سے بڑی ذلت کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ خدا کے پیغام کا امین ہونے کے باوجود زمانے کو اپنے دین کے مطابق بدلنے کے بجائے خود زمانے کی رو پر بہنے لگے اور اس کے ساتھ اپنے دین کو بھی مسخ کرنے کی کوشش کرے۔ یہ بزدلوں اور کم نظر لوگوں کا طریقہ ہے۔ یہ ان لوگوں کا طریقہ ہے جنہیں ہوائیں خس و خاشاک کی طرح اڑائے لیے پھرتی ہیں، جن کی اپنی کوئی جڑ نہیں ہے کہ وہ اس پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو سکیں۔ یہ مسلمان کا شیوہ نہیں۔ مسلمان کا شیوہ تو یہ ہے کہ

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

ضروری اعلان

خریداران حضرات خط و کتابت کرتے وقت یا منی آرڈر کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیں۔ ورنہ عدم تعمیل کی شکایت معاف ہے۔ مینجر

تفہیم القرآن

الاحزاب

(۵)

(لوگو) محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، مگر وہ اللہ کے رسول
ع۵ اور خاتم النبیین ہیں، اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۷۷ؑ

۷۷؎ اس ایک فقرے میں اُن تمام اعتراضات کی جڑ کاٹ دی گئی ہے جو مخالفین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نکاح پر کر رہے تھے۔ ان کا اولین اعتراض یہ تھا کہ آپ نے اپنی بہو سے نکاح کیا ہے حالانکہ آپ کی اپنی شریعت میں بھی بیٹے کی منکوحہ باپ پر حرام ہے۔ اس کے جواب میں فرمایا گیا کہ "وہ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں"، یعنی جس شخص کی مطلقہ سے نکاح کیا گیا ہے وہ بیٹا تھا کب کہ اس کی مطلقہ سے نکاح حرام ہوتا ؟ تم لوگ تو خود جانتے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا سرے سے کوئی بیٹا ہے ہی نہیں۔ ان کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ اچھا، اگر منہ بولا بیٹا حقیقی بیٹا نہیں ہے تب بھی اس کی چھوڑی ہوئی عورت سے نکاح کر لینا زیادہ سے زیادہ بس جائز ہی ہو سکتا تھا، آخر اس کا کرنا کیا ضرور تھا۔ اس کے جواب میں فرمایا گیا "مگر وہ اللہ کے رسول ہیں"، یعنی ان کے لیے یہ ضروری تھا کہ جس حلال چیز کو تمہاری رسموں نے خواہ مخواہ حرام کر رکھا ہے اس کے بارے میں تمام تعصبات کا خاتمہ کر دیں اور اس کی حلت کے معاملے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہنے دیں۔ پھر مزید تاکید کے لیے فرمایا "اور وہ خاتم النبیین ہیں"، یعنی ان کے بعد کوئی رسول تو درکنار کوئی نبی تک آنے والا نہیں ہے کہ اگر قانون اور معاشرے کی کوئی اصلاح ان کے زمانے میں نافذ ہونے سے رہ جائے تو بعد کا آنے والا نبی یہ کسر پوری کر دے، لہٰذا یہ اور بھی زیادہ ضروری

ہو گیا تھا کہ اس رسمِ جاہلیت کا خاتمہ وہ خود ہی کر کے جائیں۔ اس کے بعد مزید زور دیتے ہوئے فرمایا گیا کہ "اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے"۔ یعنی اللہ کو معلوم ہے کہ اس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں اس رسمِ جاہلیت کو ختم کرا دینا کیوں ضروری تھا اور ایسا نہ کرنے میں کیا قباحت تھی۔ وہ جانتا ہے کہ اب اس کی طرف سے کوئی نبی آنے والا نہیں ہے لہٰذا اگر اپنے آخری نبی کے ذریعہ سے اس نے اس رسم کا خاتمہ اب نہ کرا دیا تو پھر کوئی دوسری ہستی دنیا میں ایسی نہ ہو گی جس کے توڑنے سے یہ تمام دنیا کے مسلمانوں میں ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جاتے۔ بعد کے مصلحین اگر اسے توڑیں گے بھی تو ان میں سے کسی کا فعل بھی اپنے پیچھے ایسا دائمی اور عالمگیر اقتدار نہ رکھے گا کہ ہر ملک اور ہر زمانے میں لوگ اس کا اتباع کرنے لگیں، اور ان میں سے کسی کی شخصیت بھی اپنے اندر اس تقدس کی حامل نہ ہو گی کہ کسی فعل کا محض اس کی سنت ہونا ہی لوگوں کے دلوں سے کراہیت کے ہر تصور کا قلع قمع کر دے۔

ایک گروہ، جس نے اس دور میں نئی نبوت کا فتنۂ عظیم کھڑا کیا ہے، لفظ خاتم النبیین کے معنی "نبیوں کی مہر" کرتا ہے اور اس کا مطلب یہ لیتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو انبیاء بھی آئیں گے وہ آپ کی مہر لگنے سے نبی بنیں گے، یا بالفاظ دیگر جب تک کسی کی نبوت پر آپ کی مہر نہ لگے وہ نبی نہ ہو سکے گا۔ لیکن جس سلسلۂ بیان میں یہ آیت وارد ہوئی ہے اس کے اندر رکھ کر اسے دیکھا جائے تو اس لفظ کا یہ مفہوم لینے کی قطعاً کوئی گنجائش نظر نہیں آتی، بلکہ اگر یہی اس کے معنی ہوں تو یہاں یہ لفظ بے محل ہی نہیں، مقصودِ کلام کے بھی خلاف ہو جاتا ہے۔ آخر اس بات کا کیا تک ہے کہ اوپر سے تو نکاحِ زینب پر معترضین کے اعتراضات اور ان کے پیدا کیے ہوئے شکوک و شبہات کا جواب دیا جا رہا ہو اور یکایک یہ بات کہہ ڈالی جائے کہ محمد نبیوں کی مہر ہیں، آئندہ جو نبی بھی بنے گا، ان کی مہر لگ کر بنے گا۔ اس سیاق و سباق میں یہ بات نہ صرف یہ کہ بالکل بے تکی ہے، بلکہ اس سے وہ استدلال الٹا کمزور ہو جاتا ہے جو اوپر سے معترضین کے جواب میں چلا آ رہا ہے۔ اس صورت میں تو معترضین کے لیے یہ

کہنے کا اچھا موقع تھا کہ آپ یہ کام اِس وقت نہ کرتے تو کوئی خطرہ نہ تھا۔ اس رسم کو مٹانے کی ایسی ہی کچھ شدید ضرورت ہے تو آپ کے بعد آپ کی مہر لگ کر جو انبیاء آتے رہیں گے اُن میں سے کوئی اسے مٹا دیگا۔

ایک دوسری تاویل اس گروہ نے یہ بھی کی ہے کہ "خاتم النبیین" کے معنی افضل النبیین کے ہیں، یعنی نبوت کا دروازہ تو کھلا ہوا ہے، البتہ کمالاتِ نبوت حضورؐ پر ختم ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ مفہوم لینے میں بھی وہی قباحت ہے جو اوپر ہم نے بیان کی ہے۔ سیاق و سباق سے یہ مفہوم بھی کوئی مناسبت نہیں رکھتا، بلکہ الٹا اس کے خلاف پڑتا ہے۔ کفار و منافقین کہہ سکتے تھے کہ حضرت کم تر درجے کے ہی سہی، بہرحال آپ کے بعد بھی نبی آتے رہیں گے۔ پھر کیا ضرور تھا کہ اس رسم کو بھی آپ ہی مٹا کر تشریف لے جاتے۔

پس جہاں تک سیاق و سباق کا تعلق ہے وہ قطعی طور پر اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ یہاں خاتم النبیین کے معنی سلسلۂ نبوت کو ختم کر دینے والے ہی کے لیے جائیں اور یہ سمجھا جائے کہ حضورؐ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے لیکن یہ صرف سیاق ہی کا تقاضا نہیں ہے، لغت بھی اسی معنی کی مقتضی ہے۔ عربی لغت اور محاورے کی رُو سے "ختم" کے معنی مہر لگانے، بند کرنے، آخر تک پہنچ جانے، اور کسی کام کو پورا کر کے فارغ ہو جانے کے ہیں۔ خَتَمَ العَمَلَ کے معنی ہیں فرغ من العمل، "کام سے فارغ ہو گیا"۔ خَتَمَ الاِنَاءَ کے معنی ہیں "برتن کا منہ بند کر دیا اور اس پر مہر لگا دی تاکہ نہ کوئی چیز اس میں سے نکلے اور نہ کچھ اس کے اندر داخل ہو"۔ خَتَمَ الکِتَابَ کے معنی ہیں "خط بند کر کے اُس پر مہر لگا دی تاکہ خط محفوظ ہو جائے"۔ خَتَمَ علی القلب، "دل پر مہر لگا دی کہ نہ کوئی بات اس کی سمجھ میں آئے نہ پہلے سے جمی ہوئی کوئی بات اس میں سے نکل سکے"۔ خِتَامُ کُلِّ مشروب، "وہ مزا جو کسی چیز کو پینے کے بعد آخر میں محسوس ہوتا ہے"۔ خاتمۃ کل شیءٍ عاقبتہ و اٰخرتہ، "ہر چیز کے خاتمہ سے مراد ہے اس کی عاقبت اور آخرت"۔ ختم الشیءِ، بلغ اٰخرہ، "کسی چیز کو ختم کرنے کا مطلب ہے اس کے آخر تک پہنچ جانا"۔ اسی معنی میں ختم

قرآن بولتے ہیں اور اسی معنی میں سورتوں کی آخری آیات کو خواتیم کہا جاتا ہے۔ خاتم القوم، آخرھم "خاتم القوم سے مراد ہے قوم کا آخری آدمی" (ملاحظہ ہو لسان العرب، قاموس اور اقرب الموارد)۔ اسی بنا پر تمام اہلِ لغت اور اہلِ تفسیر نے بالاتفاق خاتم النبیین کے معنی آخر النبیین کے لیے ہیں۔ عربی لغت و محاورے کی رُو سے خاتم کے معنی ڈاک خانے کی مہر کے نہیں ہیں جسے لگا لگا کر خطوط جاری کیے جاتے ہیں، بلکہ اس سے مراد وہ مہر ہے جو لفافے پر اس لیے لگائی جاتی ہے کہ نہ اس کے اندر سے کوئی چیز باہر نکلے نہ باہر کی کوئی چیز اندر جائے۔

لغت اور سیاق و سباق کے لحاظ سے اِس لفظ کا جو مفہوم ہے اسی کی تائید نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریحات کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر چند صحیح ترین احادیث ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

(۱) قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم کانت بنوا اسرائیل تسوسھم الانبیاء کلما ھلك نبی خلفه نبی، وانه لانبی بعدی وسیکون خلفاء (بخاری، کتاب المناقب، باب ماذکر عن بنی اسرائیل)	نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بنی اسرائیل کی قیادت انبیاء کیا کرتے تھے۔ جب کوئی نبی مر جاتا تو دوسرا نبی اس کا جانشین ہوتا۔ مگر میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا بلکہ خلفاء ہوں گے۔
(۲) قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان مثلی و مثل الانبیاء من قبلی کمثل رجلٍ بنیٰ بیتًا فاحسنه واجمله الا موضع لبنةٍ من زاویةٍ فجعل الناس یطوفون به ویعجبون له ویقولون ھلا وُضِعت ھذہ اللبنة، فانا اللبنة وانا خاتم النبیین (بخاری، کتاب المناقب، باب خاتم النبیین)	نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری اور مجھ سے پہلے گزرے ہوئے انبیاء کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے ایک عمارت بنائی اور خوب حسین و جمیل بنائی مگر ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ چھوٹی ہوئی تھی۔ لوگ اس عمارت کے گرد پھرتے اور اس کی خوبی پر اظہارِ حیرت کرتے تھے، مگر کہتے تھے کہ اس جگہ اینٹ کیوں نہ رکھی گئی؟ تو وہ اینٹ میں ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں

(یعنی میرے آنے پر نبوت کی عمارت مکمل ہو چکی ہے، اب کوئی جگہ باقی نہیں ہے جسے پُر کرنے کے لیے کوئی نبی آئے)۔

اِسی مضمون کی چار حدیثیں مسلم، کتاب الفضائل، باب خاتم النبیین میں ہیں اور آخری حدیث میں یہ الفاظ زائد ہیں: فجئت فختمت الانبیاء "پس میں آیا اور میں نے انبیاء کا سلسلہ ختم کر دیا"۔

یہی حدیث انہی الفاظ میں ترمذی، کتاب المناقب، باب فضل النبی، اور کتاب الآداب، باب الامثال میں ہے۔

مُسند ابو داؤد طَیالسی میں یہ حدیث جابر بن عبداللہ کی روایت کردہ احادیث کے سلسلے میں آئی ہے اور اس کے آخری الفاظ یہ ہیں: ختم بی الانبیاء "میرے ذریعہ سے انبیاء کا سلسلہ ختم کیا گیا"۔

مُسند احمد میں تھوڑے سے لفظی فرق کے ساتھ اس مضمون کی احادیث حضرت اُبَی بن کعب، حضرت ابو سعید خُدری اور حضرت ابوہریرۃؓ سے نقل کی گئی ہیں۔

(۳) ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال فُضِّلْتُ علی الانبیاء بِسِتٍّ، اُعطیت جوامع الکلم، ونُصرت بالرعب، واحلت لی الغنائم، وجُعلت لی الارض مسجداً وطھوراً، واُرسِلْتُ الی الخلق کافۃ، وختم بی النبیون۔ (مسلم، ترمذی، ابن ماجہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے چھ باتوں میں انبیاء پر فضیلت دی گئی ہے۔ (۱) مجھے جامع و مختصر بات کہنے کی صلاحیت دی گئی۔ (۲) مجھے رُعب کے ذریعہ سے نصرت بخشی گئی۔ (۳) میرے لیے اموالِ غنیمت حلال کیے گئے۔ (۴) میرے لیے زمین کو مسجد بھی بنا دیا گیا (یعنی میری شریعت میں نماز صرف مخصوص عبادت گاہوں میں ہی نہیں بلکہ روئے زمین پر ہر جگہ پڑھی جا سکتی ہے) اور پاکیزگی حاصل کرنے کا ذریعہ بھی (یعنی پانی نہ ملے تو میری شریعت میں تیمم کر کے وضو کی حاجت بھی پوری کی جا سکتی ہے اور غسل کی

حاجت بھی)۔ (۵) مجھے تمام دنیا کے لیے رسول بنایا گیا۔ (۶) اور میرے اوپر انبیاء کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔

(۴) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان الرسالۃ والنبوۃ قد انقطعت فلا رسول بعدی ولا نبی (ترمذی، کتاب الرؤیا، باب ذہاب النبوۃ۔ مسند احمد، مرویات انس بن مالک)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رسالت اور نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ میرے بعد اب نہ کوئی رسول ہے اور نہ نبی۔

(۵) قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم انا محمد، وانا احمد، وانا الماحی الذی یمحی بی الکفر، وانا الحاشر الذی یحشر الناس علی عقبی، وانا العاقب والعاقب الذی لیس بعدہٗ نبی (بخاری و مسلم، کتاب الفضائل، باب اسماء النبی۔ ترمذی، کتاب الآداب، باب اسماء النبی۔ موطاء، کتاب اسماء النبی۔ المستدرک للحاکم، کتاب التاریخ، باب اسماء النبی)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں محمد ہوں، میں احمد ہوں۔ میں ماحی ہوں کہ میرے ذریعہ سے کفر محو کیا جائے گا۔ میں حاشر ہوں کہ میرے بعد لوگ حشر میں جمع کیے جائیں گے (یعنی میرے بعد اب بس قیامت ہی آنی ہے) اور میں عاقب ہوں، اور عاقب وہ ہے جس کے بعد کوئی نبی نہ ہو۔

(۶) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ لم یبعث نبیا الا حذر امتہ الدجال وانا اٰخر الانبیاء و انتم اٰخر الامم وھو خارج فیکم لا محالۃ (ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب الدجال)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی نہیں بھیجا جس نے اپنی امت کو دجال کے خروج سے نہ ڈرایا ہو (مگر ان کے زمانے میں وہ نہ آیا)۔ اب میں آخری نبی ہوں اور تم آخری امت ہو۔ لامحالہ اب اس کو تمہارے اندر نکلنا ہے۔

(۷) عن عبد الرحمن بن جبیر قال

عبدالرحمٰن بن جُبَیر کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن

سمعت عبداللہ بن عمرو بن عاص یقول خرج علینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یومًا کالمودِّع فقال انا محمد النبی الامی ثلاثًا ولا نبی بعدی (مسند احمد، مرویات عبداللہ بن عمرو بن عاص)

عمرو بن عاص کو یہ کہتے سنا کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مکان سے نکل کر ہمارے درمیان تشریف لائے اس انداز سے کہ گویا آپ ہم سے رخصت ہو رہے ہیں۔ آپ نے تین مرتبہ فرمایا "میں محمد نبی امی ہوں" پھر فرمایا "اور میرے بعد کوئی نبی نہیں"۔

(۸) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا نبوۃ بعدی الا المبشرات۔ قیل وما المبشرات یا رسول اللہ؟ قال الرؤیا الحسنۃ۔ اوقال الرؤیا الصالحۃ (مسند احمد، مرویات ابوالطفیل۔ نسائی۔ ابوداؤد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میرے بعد کوئی نبوت نہیں ہے، صرف بشارت دینے والی باتیں ہیں"۔ عرض کیا گیا وہ بشارت دینے والی باتیں کیا ہیں یا رسول اللہ؟ فرمایا اچھا خواب، یا فرمایا صالح خواب۔ (یعنی وحی کا اب کوئی امکان نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ اگر کسی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی اشارہ ملے گا بھی تو بس اچھے خواب کے ذریعہ سے مل جائے گا)۔

(۹) قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لو کان بعدی نبی لکان عمر بن الخطاب (ترمذی، کتاب المناقب)۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے بعد اگر کوئی نبی ہوتا تو عمر بن خطاب ہوتا۔

(۱۰) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعلی انت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ، الا انہ لا نبی بعدی (بخاری و مسلم، کتاب فضائل الصحابہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا میرے ساتھ تمہاری نسبت وہی ہے جو موسیٰ کے ساتھ ہارون کی تھی، مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔

بخاری و مسلم نے یہ حدیث غزوۂ تبوک کے ذکر میں بھی نقل کی ہے۔ مسند احمد میں اس مضمون کی دو حدیثیں حضرت سعد بن ابی وقاص سے روایت کی گئی ہیں جن میں سے ایک کا آخری فقرہ یوں ہے: الا انہ لا نبوۃ بعدی "مگر میرے بعد کوئی نبوت نہیں ہے"۔ ابوداؤد طیالسی، امام احمد اور محمد بن اسحاق نے اس سلسلے میں جو تفصیلی روایات نقل کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ تبوک کے لیے تشریف لے جاتے وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو مدینہ طیبہ کی حفاظت و نگرانی کے لیے اپنے پیچھے چھوڑنے کا فیصلہ فرمایا تھا۔ منافقین نے اس پر طرح طرح کی باتیں اُن کے بارے میں کہنی شروع کر دیں۔ انہوں نے جا کر حضورؐ سے عرض کیا "یارسول اللہ کیا آپ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑے جا رہے ہیں؟" اس موقع پر حضورؐ نے ان کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ "تم تو میرے ساتھ وہی نسبت رکھتے ہو جو موسیٰ کے ساتھ ہارون رکھتے تھے"۔ یعنی جس طرح حضرت موسیٰ نے کوہ طور پر جاتے ہوئے حضرت ہارون کو بنی اسرائیل کی نگرانی کے لیے پیچھے چھوڑا تھا اسی طرح میں تم کو مدینے کی حفاظت کے لیے چھوڑے جا رہا ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی حضورؐ کو اندیشہ ہوا کہ حضرت ہارونؑ کے ساتھ یہ تشبیہ کہیں بعد میں کسی فتنے کی موجب نہ بن جائے، اس لیے فوراً آپ نے یہ تصریح فرما دی کہ میرے بعد کوئی شخص نبی ہونے والا نہیں ہے۔

(۱۱) عن ثوبان قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم... وانہ سیکون فی امتی کذابون ثلاثون کلھم یزعم انہ نبی وانا خاتم النبیین لا نبی بعدی (ابوداؤد، کتاب الفتن)	ثوبان سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا... اور یہ کہ میری امت میں تیس کذاب ہوں گے جن میں سے ہر ایک نبی ہونے کا دعویٰ کرے گا، حالانکہ میں خاتم النبیین ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں۔

اسی مضمون کی ایک اور حدیث ابوداؤد نے کتاب الملاحم میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے۔ ترمذی نے بھی حضرت ثوبانؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے یہ دونوں روایتیں نقل کی ہیں اور دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں: حتی یبعث دجالون کذابون قریب من

ثلاثين كلهم يزعم انه رسول الله" یہاں تک کہ اٹھیں گے تیس کے قریب جھوٹے فریبی جن میں سے ہر ایک دعویٰ کریگا کہ وہ اللہ کا رسول ہے"

(۱۲) قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لقد کان فیمن کان قبلکم من بنی اسرائیل رجال یکلمون من غیر ان یکونوا انبیاء فان یکن من امتی احد فعمر (بخاری، کتاب المناقب)	نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم سے پہلے جو بنی اسرائیل گزرے ہیں ان میں ایسے لوگ ہوئے ہیں جن سے کلام کیا جاتا تھا بغیر اس کے کہ وہ نبی ہوں، میری امت میں اگر کوئی ہوا تو وہ عمر ہوگا۔

مسلم میں اس مضمون کی جو حدیث ہے اس میں یکلمون کے بجائے محدَّثون کا لفظ ہے۔ لیکن مکلَّم اور محدَّث، دونوں کے معنی ایک ہی ہیں، یعنی ایسا شخص جو مکالمہ الٰہی سے سرفراز ہو یا جس کے ساتھ پردۂ غیب سے بات کی جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبوت کے بغیر مخاطبۂ الٰہی سے سرفراز ہونے والے بھی اس امت میں اگر کوئی ہوتے تو وہ حضرت عمرؓ ہوتے۔

(۱۳) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا نبی بعدی ولا امة بعد امتی۔ (بیہقی، کتاب الرؤیا۔ طبرانی)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے بعد کوئی نبی نہیں اور میری امت کے بعد کوئی امت (یعنی کسی نئے آنے والی نبی کی امت) نہیں۔
(۱۴) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فانی آخر الانبیاء وان مسجدی آخر المساجد (مسلم، کتاب الحج، باب فضل الصلوٰة بمسجد مکة والمدینة)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں آخری نبی ہوں اور میری مسجد آخری مسجد (یعنی مسجد نبوی) ہے۔

یہ احادیث بکثرت صحابہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہیں اور بکثرت محدثین نے ان کو بہت سی قوی سندوں سے نقل کیا ہے۔ ان کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے مختلف مواقع پر، مختلف طریقوں سے، مختلف الفاظ میں اس امر کی تصریح

فرمائی ہے کہ آپ آخری نبی ہیں، آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، نبوت کا سلسلہ آپ پر ختم ہو چکا ہے، اور آپ کے بعد جو لوگ بھی رسول یا نبی ہونے کا دعویٰ کریں وہ دجّال و کذّاب ہیں۔ قرآن کے الفاظ "خاتم النبیین" کی اس سے زیادہ مستند و معتبر اور قطعی الثبوت تشریح اور کیا ہو سکتی ہے۔ رسول پاک کا ارشاد تو بجائے خود سند و حجت ہے، مگر جب وہ قرآن کی ایک نص کی شرح کر رہا ہو تب تو وہ اور بھی زیادہ قوی حجت بن جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر قرآن کو سمجھنے والا اور اس کی تفسیر کا حق دار اور کون ہو سکتا ہے کہ وہ ختم نبوت کا کوئی دوسرا مفہوم بیان کرے اور ہم اُسے قبول کرنا کیا معنی قابل التفات بھی سمجھیں؟

قرآن و سنت کے بعد تیسرے درجے میں اہم ترین حیثیت صحابۂ کرام کے اجماع کی ہے۔ یہ بات تمام معتبر تاریخی روایات سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد جن لوگوں نے نبوت کا دعویٰ کیا، اور جن لوگوں نے ان کی نبوت تسلیم کی، اُن سب کے خلاف صحابۂ کرام نے بالاتفاق جنگ کی تھی۔ اس سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ مُسیلمۂ کذّاب کا معاملہ قابلِ ذکر ہے۔ یہ شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا منکر نہ تھا بلکہ اس کا دعویٰ یہ تھا کہ اُسے حضورؐ کے ساتھ شریکِ نبوت بنایا گیا ہے۔ اُس نے حضورؐ کی وفات سے پہلے جو عریضہ آپ کو لکھا تھا اس کے الفاظ یہ ہیں:

من مسیلمۃ رسول اللہ الی محمد رسول اللہ سلام علیک، فانی اُشرکت فی الامر معک (طبری، جلد دوم، ص ۳۹۹، طبع مصر)	مسیلمہ رسول اللہ کی طرف سے محمد رسول اللہ کی طرف۔ آپ پر سلام ہو۔ آپ کو معلوم ہو کہ میں آپ کے ساتھ نبوت کے کام میں شریک کیا گیا ہوں۔

اس صریح اقرارِ رسالتِ محمدی کے باوجود اسے کافر اور خارج از ملت قرار دیا گیا اور اس سے جنگ کی گئی۔ تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ بنو حنیفہ نیک نیتی کے ساتھ (IN GOOD FAITH

اُس پر ایمان لائے تھے اور انہیں واقعی اس غلط فہمی میں ڈالا گیا تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو خود شریک رسالت کیا ہے۔ نیز قرآن کی آیات کو اُن کے سامنے مسیلمہ پر نازل شدہ آیات کی حیثیت سے ایک ایسے شخص نے پیش کیا تھا جو مدینہ طیبہ سے قرآن کی تعلیم حاصل کر کے گیا تھا (البدایہ والنہایہ لابن کثیر، جلد ۵، ص ۵۱)۔ مگر اس کے باوجود صحابہ کرام نے ان کو مسلمان تسلیم نہیں کیا اور ان پر فوج کشی کی۔ پھر یہ کہنے کی بھی گنجائش نہیں کہ صحابہ نے ان کے خلاف ارتداد کی بنا پر نہیں بلکہ بغاوت کے جرم میں جنگ کی تھی۔ اسلامی قانون کی رو سے باغی مسلمانوں کے خلاف اگر جنگ کی نوبت آئے تو ان کے اسیران جنگ غلام نہیں بنائے جا سکتے۔ بلکہ مسلمان تو درکنار، ذمی بھی اگر باغی ہوں تو گرفتار ہونے کے بعد ان کو غلام بنانا جائز نہیں ہے لیکن مسیلمہ اور اس کے پیروؤں پر جب چڑھائی کی گئی تو حضرت ابوبکرؓ نے اعلان فرمایا کہ ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنایا جائے گا۔ اور جب وہ لوگ اسیر ہوئے تو فی الواقع ان کو غلام بنایا گیا، چنانچہ انہی میں سے ایک لونڈی حضرت علیؓ کے حصے میں آئی جس کے بطن سے تاریخ اسلام کی مشہور شخصیت محمد بن حنفیہ نے جنم لیا (البدایہ والنہایہ، جلد ۶، ص ۳۱۶ و ۳۲۵)۔ اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ صحابہ نے جس جرم کی بنا پر ان سے جنگ کی تھی وہ بغاوت کا جرم نہ تھا بلکہ یہ جرم تھا کہ ایک شخص نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دعویٰ کیا اور دوسرے لوگ اس کی نبوت پر ایمان لائے۔ یہ کارروائی حضورؐ کی وفات کے فوراً بعد ہوئی ہے، ابوبکر صدیقؓ کی قیادت میں ہوئی ہے، اور صحابہ کی پوری جماعت کے اتفاق سے ہوئی ہے۔ اجماع صحابہ کی اس سے زیادہ صریح مثال شاید ہی کوئی اور ہو۔

اجماعِ صحابہ کے بعد چوتھے نمبر پر مسائلِ دین میں جس چیز کو حجت کی حیثیت حاصل ہے وہ دورِ صحابہ کے بعد کے علمائے امت کا اجماع ہے۔ اس لحاظ سے جب ہم دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ پہلی صدی سے لے کر آج تک ہر زمانے کے، اور پوری دنیائے اسلام میں ہر ملک کے علماء اس عقیدے پر متفق ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی شخص نبی نہیں ہو سکتا۔

اور یہ کہ جو بھی آپ کے بعد اس منصب کا دعویٰ کرے، یا اس کو مانے، وہ کافر خارج از ملت اسلام ہے۔ اس سلسلہ کے بھی چند شواہد ملاحظہ ہوں:

(۱) امام ابوحنیفہ (۸۰ھ۔ ۱۵۰ھ) کے زمانے میں ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا اور کہا "مجھے موقع دو کہ میں اپنی نبوت کی علامات پیش کروں۔" اس پر امام اعظم نے فرمایا کہ "جو شخص اس سے نبوت کی کوئی علامت طلب کرے گا وہ بھی کافر ہو جائے گا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما چکے ہیں کہ لانبی بعدی" (مناقب الامام الاعظم ابی حنیفہ۔ لابن احمد المکی۔ ج ۱۔ ص ۱۶۱۔ مطبوعہ حیدر آباد ۱۳۲۱ھ)

(۲) علامہ ابن جریر طبری (۲۲۴ھ۔ ۳۱۰ھ) اپنی مشہور تفسیر قرآن میں آیت ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین کا مطلب بیان کرتے ہیں: الذی ختم النبوۃ فطبع علیہا فلا تفتح لاحد بعدہ الی قیام الساعۃ "جس نے نبوت کو ختم کر دیا اور اس پر مہر لگادی، اب قیامت تک یہ دروازہ کسی کے لیے نہیں کھلے گا" (تفسیر ابن جریر، جلد ۲۲، صفحہ ۱۲)

(۳) علامہ ابن حزم اندلسی (۳۸۴ھ۔ ۴۵۶ھ) لکھتے ہیں: "یقیناً وحی کا سلسلہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد منقطع ہو چکا ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ وحی نہیں ہوتی مگر ایک نبی کی طرف، اور اللہ عزوجل فرما چکا ہے کہ محمدؐ نہیں ہیں تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ، مگر وہ اللہ کے رسول اور نبیوں کے خاتم ہیں۔" (المحلّی، ج ۱، ص ۲۶)

(۴) امام غزالی (۴۵۰ھ۔ ۵۰۵ھ) فرماتے ہیں: "امت نے بالاتفاق اس لفظ (لانبیَ بعدی) سے یہ سمجھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بعد کسی نبی اور کسی رسول کے کبھی نہ آنے کی تصریح فرما چکے ہیں، اور یہ کہ اس میں کسی تاویل و تخصیص کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اب جو شخص اس کی تاویل کر کے اسے کسی خاص معنی کے ساتھ مخصوص کرے اس کا کلام محض بکواس ہے جس پر تکفیر کا حکم لگانے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ کیونکہ وہ اُس نص کو جھٹلا رہا ہے جس کے متعلق تمام امت کا اجماع ہے کہ اس کی نہ تاویل کی جا سکتی ہے اور نہ وہ مخصوص ہے۔"

(الاقتصاد فی الاعتقاد، ص ۱۱۳)

(۵) محی السنہ البغوی (متوفی ۵۱۰ھ) اپنی تفسیر معالم التنزیل میں لکھتے ہیں: "اللہ نے آپ کے ذریعہ سے نبوت کو ختم کیا، پس آپ انبیاء کے خاتم ہیں ۔ ۔ ۔ اور ابن عباس کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (اس آیت میں) یہ فیصلہ فرما دیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔" (جلد ۳، ص ۱۵۸)

(۶) علامہ زمخشری (۴۶۷ھ - ۵۳۸ھ) تفسیر کشاف میں لکھتے ہیں: "اگر تم کہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی کیسے ہوتے جبکہ حضرت عیسیٰ آخر زمانے میں نازل ہونگے؟ تو میں کہوں گا کہ آپ کا آخری نبی ہونا اس معنی میں ہے کہ آپ کے بعد کوئی شخص نبی نہ بنایا جائیگا، اور عیسیٰ علیہ السلام اُن لوگوں میں سے ہیں جو آپ سے پہلے نبی بنائے جاچکے تھے، اور جب وہ نازل ہوں گے تو شریعتِ محمدیہ کے پیرو اور آپ کے قبلے کی طرف نماز پڑھنے والے کی حیثیت سے نازل ہونگے، گویا کہ وہ آپ ہی کی امت کے ایک فرد ہیں۔" (جلد ۲، ص ۲۱۵)

(۷) قاضی عیاض (متوفی ۵۴۴ھ) لکھتے ہیں: "جو شخص خود اپنے حق میں نبوت کا دعویٰ کرے یا اس بات کو جائز رکھے کہ آدمی نبوت کا اکتساب کر سکتا ہے اور صفائی قلب کے ذریعہ سے مرتبۂ نبوت کو پہنچ سکتا ہے (جیسا کہ بعض فلسفی اور غالی صوفی کہتے ہیں)، اور اسی طرح جو شخص نبوت کا دعویٰ تو نہ کرے مگر یہ دعویٰ کرے کہ اس پر وحی آتی ہے، ۔ ۔ ۔ ایسے سب لوگ کافر اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جھٹلانے والے ہیں۔ کیونکہ آپ نے خبر دی ہے کہ آپ خاتم النبیین ہیں، آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں۔ اور آپ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ خبر پہنچائی ہے کہ آپ نبوت کے ختم کرنے والے ہیں اور تمام انسانوں کی طرف آپ کو بھیجا گیا ہے۔ اور تمام امت کا اس پر اجماع ہے کہ یہ کلام اپنے ظاہر مفہوم پر محمول ہے، اس کے معنی و مفہوم میں کسی تاویل و تخصیص کی گنجائش نہیں ہے۔ لہٰذا ان تمام گروہوں کے کافر ہونے میں قطعاً کوئی شک نہیں، بربنائے اجماع بھی اور بربنائے نقل بھی۔" (شفاء، جلد ۲، ص ۲۷۰ - ۲۷۱)

(۸) علامہ شہرستانی (متوفی ۵۴۸ھ) اپنی مشہور کتاب الملل والنحل میں لکھتے ہیں: "اور اسی طرح جو کہے . . . کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی آنے والا ہے (بجز عیسیٰ علیہ السلام کے) تو اس کے کافر ہونے میں دو آدمیوں کے درمیان بھی اختلاف نہیں ہے" (جلد ۳، ص ۲۴۹)

(۹) امام رازی (۵۴۳ھ-۶۰۶ھ) اپنی تفسیر کبیر میں آیت خاتم النبیین کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "اس سلسلۂ بیان میں وخاتم النبیین اس لیے فرمایا کہ جس نبی کے بعد کوئی دوسرا نبی ہو وہ اگر نصیحت اور توضیح احکام میں کوئی کسر چھوڑ جائے تو اس کے بعد آنے والا نبی اسے پورا کر سکتا ہے۔ مگر جس کے بعد کوئی آنے والا نبی نہ ہو وہ اپنی امت پر زیادہ شفیق ہوتا ہے اور اس کو زیادہ واضح رہنمائی دیتا ہے کیونکہ اس کی مثال اُس باپ کی ہوتی ہے جو جانتا ہے کہ اس کے بیٹے کا کوئی ولی و سرپرست اُس کے بعد نہیں ہے" (جلد ۶، ص ۵۸۱)

(۱۰) علامہ بیضاوی (متوفی ۶۸۵ھ) اپنی تفسیر انوار التنزیل میں لکھتے ہیں: "یعنی آپ انبیاء میں سب سے آخری نبی ہیں جس نے ان کا سلسلہ ختم کر دیا، یا جس سے انبیاء کے سلسلے پر مہر کر دی گئی۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کا آپ کے بعد نازل ہونا اس ختم نبوت میں قادح نہیں ہے کیونکہ جب وہ نازل ہوں گے تو آپ ہی کے دین پر ہوں گے" (جلد ۴، ص ۱۶۴)

(۱۱) علامہ حافظ الدین النسفی (متوفی ۷۱۰ھ) اپنی تفسیر "مدارک التنزیل" میں لکھتے ہیں: "اور آپ خاتم النبیین ہیں . . . یعنی نبیوں میں سب سے آخری۔ آپ کے بعد کوئی شخص نبی نہیں بنایا جائے گا۔ رہے عیسیٰ تو وہ ان انبیاء میں سے ہیں جو آپ سے پہلے نبی بنائے جا چکے تھے۔ اور جب وہ نازل ہوں گے تو شریعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرنے والے کی حیثیت سے نازل ہوں گے گویا کہ وہ آپ کی امت کے افراد میں سے ہیں" (ص ۴۷۱)

(۱۲) علامہ علاؤ الدین البغدادی (متوفی ۷۲۵ھ) اپنی تفسیر "خازن" میں لکھتے ہیں: "وَخَاتَمَ النَّبِيِّيْنَ، یعنی اللہ نے آپ پر نبوت ختم کر دی، اب نہ آپ کے بعد کوئی نبوت ہے نہ آپ کے ساتھ کوئی اس میں شریک . . . . وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا یعنی یہ بات اللہ کے علم میں ہے

کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں" (ص ۱۷۴-۴۷۲)

(۱۳) علامہ ابن کثیر (متوفی ۷۷۴ھ) اپنی مشہور و معروف تفسیر میں لکھتے ہیں: "پس یہ آیت اس باب میں نص صریح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں ہے، اور جب آپ کے بعد نبی کوئی نہیں تو رسول بدرجۂ اولیٰ نہیں ہے، کیونکہ رسالت کا منصب خاص ہے اور نبوت کا منصب عام۔ ہر رسول نبی ہوتا ہے مگر ہر نبی رسول نہیں ہوتا... حضورؐ کے بعد جو شخص بھی اس مقام کا دعویٰ کرے وہ جھوٹا، مفتری، دجال، گمراہ اور گمراہ کرنے والا ہے خواہ وہ کیسے ہی خرقِ عادت اور شعبدے اور جادو اور طلسم اور کرشمے بنا کر لے آئے... یہی حیثیت ہر اس شخص کی ہے جو قیامت تک اس منصب کا مدعی ہو" (جلد ۳- ص ۴۹۳-۴۹۴)

(۱۴) علامہ جلال الدین سُیُوطی (متوفی ۹۱۱ھ) تفسیر جلالین میں لکھتے ہیں: "وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا یعنی اللہ اس بات کو جانتا ہے کہ آنحضرتؐ کے بعد کوئی نبی نہیں۔ اور عیسیٰؑ جب نازل ہونگے تو آپ کی شریعت ہی کے مطابق عمل کریں گے" (ص ۷۶۸)

(۱۵) علامہ ابن نجیم (متوفی ۹۷۰ھ) اصولِ فقہ کی مشہور کتاب الاشباہ والنظائر، کتاب السیر، باب الردّہ میں لکھتے ہیں: "اگر آدمی یہ نہ سمجھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں تو وہ مسلمان نہیں ہے، کیونکہ یہ اُن باتوں میں سے ہے جن کا جاننا اور ماننا ضروریاتِ دین میں سے ہے" (ص ۱۷۹)

(۱۶) ملّا علی قاری (متوفی ۱۰۱۶ھ) شرح فقہ اکبر میں لکھتے ہیں: "ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنا بالاجماع کفر ہے" (ص ۲۰۲)

(۱۷) شیخ اسماعیل حقی (متوفی ۱۱۳۷ھ) تفسیر روح البیان میں اس آیت کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "عاصم نے لفظ خاتم ت کے زبر کے ساتھ پڑھا ہے جس کے معنی ہیں آلۂ ختم کے جس سے مہر کی جاتی ہے۔ جیسے طابع اس چیز کو کہتے ہیں جس سے ٹھپا لگایا جائے۔ مراد یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء میں سب سے آخر تھے جن کے ذریعہ سے نبیوں کے سلسلے پر مہر

لگادی گئی۔ فارسی میں اسے "مُہرِ پیغمبراں" کہیں گے۔ یعنی آپ سے نبوت کا دروازہ سر بمہر کر دیا گیا اور پیغمبروں کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ باقی قاریوں نے اسے ت کے زیر کے ساتھ خاتِم پڑھا ہے یعنی آپ مُہر کرنے والے تھے۔ فارسی میں اس کو "مُہر کنندۂ پیغمبراں" کہیں گے۔ اس طرح یہ لفظ بھی خاتَم کا ہم معنی ہی ہے۔ . . . اب آپ کی امت کے علماء آپ سے صرف ولایت ہی کی میراث پائیں گے نبوت کی میراث آپ کی ختمیت کے باعث ختم ہو چکی۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کا آپ کے بعد نازل ہونا آپ کے خاتم النبیین ہونے میں قادِح نہیں ہے کیونکہ خاتم النبیین ہونے کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہ بنایا جائے گا . . . اور عیسیٰ آپ سے پہلے نبی بنائے جا چکے تھے۔ اور جب وہ نازل ہونگے تو شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو کی حیثیت سے نازل ہونگے۔ آپ ہی کے قبلے کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھیں گے۔ آپ کی امت کے ایک فرد کی طرح ہونگے نہ ان کی طرف وحی آئے گی اور نہ وہ نئے احکام دیں گے۔ بلکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ ہونگے . . . . . اور اہل سنت والجماعت اس بات کے قائل ہیں کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لانبی بعدی۔ اب جو کوئی کہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی ہے تو اس کو کافر قرار دیا جائے گا، کیونکہ اس نے نص کا انکار کیا۔ اور اسی طرح اُس شخص کی بھی تکفیر کی جائیگی جو اس میں شک کرے، کیونکہ حجت نے حق کو باطل سے ممیز کر دیا ہے۔ اور جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دعویٰ کرے اس کا دعویٰ باطل کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔" (جلد ۲۲، ص ۱۸۸)۔

(۱۸) فتاویٰ عالمگیری، جسے بارھویں صدی ہجری میں اورنگ زیب عالمگیر کے حکم سے ہندوستان کے بہت سے اکابر علماء نے مرتب کیا تھا، اس میں لکھا ہے: "اگر آدمی یہ نہ سمجھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں تو وہ مسلم نہیں ہے۔ اور اگر وہ کہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں یا پیغمبر ہوں تو اس کی تکفیر کی جائے گی" (جلد ۲، ص ۲۶۳)

(۱۹) علامہ شوکانی (متوفی ۱۲۵۵ھ) اپنی تفسیر فتح القدیر میں لکھتے ہیں: "جمہور نے لفظ خاتم کو ت کے زیر کے ساتھ پڑھا ہے اور عاصم نے زبر کے ساتھ۔ پہلی قرأت کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے انبیاء کو ختم کیا، یعنی سب کے آخر میں آئے۔ اور دوسری قرأت کے معنی یہ ہیں کہ آپ اُن کے لیے مُہر کی طرح ہو گئے جس کے ذریعہ سے ان کا سلسلہ سربمہر ہو گیا اور جس کے شمول سے ان کا گروہ مزین ہوا۔" (جلد ۴، ص ۲۷۵)

(۲۰) علامہ آلوسی (متوفی ۱۲۷۰ھ) تفسیر روح المعانی میں لکھتے ہیں: "نبی کا لفظ رسول کی بہ نسبت عام ہے۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے خاتم النبیین ہونے سے خود بخود لازم آتا ہے کہ آپ خاتم المرسلین بھی ہوں۔ اور آپ کے خاتم انبیاء و رسل ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس دنیا میں وصفِ نبوت سے آپ کے متصف ہونے کے بعد اب جن وانس میں سے ہر ایک کے لیے نبوت کا وصف منقطع ہو گیا" (جلد ۲۲، ص ۳۲) "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو شخص وحی نبوت کا مدعی ہو اسے کافر قرار دیا جائے گا۔ اس امر میں مسلمانوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے" (جلد ۲۲، ص ۳۸) "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا خاتم النبیین ہونا ایک ایسی بات ہے جسے کتاب اللہ نے صاف صاف بیان کیا، سنت نے واضح طور پر اس کی تصریح کی، اور امت نے اس پر اجماع کیا۔ لہٰذا جو اس کے خلاف کوئی دعویٰ کرے اسے کافر قرار دیا جائے گا۔" (جلد ۲۲، ص ۳۹)۔

یہ ہندوستان سے لیکر مراکش اور اندلس تک، اور ٹرکی سے لیکر یمن تک ہر مسلمان ملک کے اکابر علماء و فقہاء اور محدثین و مفسرین کی تصریحات ہیں۔ ہم نے ان کے ناموں کے ساتھ ان کے سنینِ ولادت و وفات بھی دے دیئے ہیں جن سے ہر شخص بیک نظر معلوم کر سکتا ہے کہ پہلی صدی سے تیرھویں صدی تک تاریخِ اسلام کی ہر صدی کے اکابر اِن میں شامل ہیں۔ اگرچہ ہم چودھویں صدی کے علمائے اسلام کی تصریحات بھی نقل کر سکتے تھے، مگر ہم نے قصداً انہیں اس لیے چھوڑ دیا کہ وہ مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کے ہم عصر ہیں اور ایک شخص یہ حیلہ کر سکتا ہے

مگر ان لوگوں نے مرزا صاحب کی ضد میں ختمِ نبوت کے یہ معنی بیان کیے ہیں۔ اس لیے ہم نے مرزا صاحب سے پہلے کے علماء کی تحریریں نقل کی ہیں جو ظاہر ہے کہ ان سے کوئی ضد نہ رکھ سکتے تھے۔ ان تحریروں سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ پہلی صدی سے آج تک پوری دنیائے اسلام متفقہ طور پر "خاتم النبیین" کے معنی "آخری نبی" ہی سمجھتی رہی ہے، حضورؐ کے بعد نبوت کے دروازے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند تسلیم کرنا ہر زمانے میں تمام مسلمانوں کا متفق علیہ عقیدہ رہا ہے، اور اس امر میں مسلمانوں کے درمیان کبھی کوئی اختلاف نہیں رہا کہ جو شخص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد رسول یا نبی ہونے کا دعویٰ کرے اور جو اس کے دعوے کو مانے وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ اب یہ دیکھنا ہر صاحبِ عقل آدمی کا اپنا کام ہے کہ لفظ خاتم النبیین کا جو مفہوم لغت سے ثابت ہے، جو قرآن کی عبارت کے سیاق و سباق سے ظاہر ہے، جس کی تصریح نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے خود فرما دی ہے، جس پر صحابۂ کرام کا اجماع ہے، اور جسے صحابۂ کرام کے زمانے سے لیکر آج تک تمام دنیا کے مسلمان بلا اختلاف مانتے رہے ہیں، اس کے خلاف کوئی دوسرا مفہوم لینے اور کسی نئے مدعی کے لیے نبوت کا دروازہ کھولنے کی کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے، اور ایسے لوگوں کو کیسے مسلمان تسلیم کیا جا سکتا ہے جنہوں نے بابِ نبوت کے مفتوح ہونے کا محض خیال ہی ظاہر نہیں کیا ہے بلکہ اس دروازے سے ایک صاحب حریمِ نبوت میں داخل بھی ہو گئے ہیں اور یہ لوگ ان کی نبوت پر ایمان بھی لے آئے ہیں۔

اس سلسلے میں تین باتیں اور قابلِ غور ہیں:

پہلی بات یہ ہے کہ نبوت کا معاملہ ایک بڑا ہی نازک معاملہ ہے۔ قرآن مجید کی رُو سے یہ اسلام کے اُن بنیادی عقائد میں سے ہے جن کے ماننے یا نہ ماننے پر آدمی کے کفر و ایمان کا انحصار ہے۔ ایک شخص نبی ہو اور آدمی اس کو نہ مانے تو کافر، اور وہ نبی نہ ہو اور آدمی اس کو مان لے تو کافر۔ ایسے ایک نازک معاملے میں اللہ تعالیٰ سے کسی بے احتیاطی کی ہرگز توقع نہیں کی جا سکتی۔ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد کوئی نبی آنے والا ہوتا تو اللہ تعالیٰ خود قرآن میں صاف صاف

اس کی تصریح فرماتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اس کا کھلا کھلا اعلان کراتا اور حضور دنیا سے کبھی تشریف نہ لے جاتے جب تک اپنی امت کو اچھی طرح خبردار نہ کر دیتے کہ میرے بعد بھی انبیاء آئیں گے اور تمہیں ان کو ماننا ہوگا۔ آخر اللہ اور اس کے رسول کو ہمارے دین و ایمان سے کیا دشمنی تھی کہ حضورؐ کے بعد نبوت کا دروازہ تو کھلا ہوتا اور کوئی نبی آنے والا بھی ہوتا جس پر ایمان لائے بغیر ہم مسلمان نہ ہو سکتے، مگر ہم کو نہ صرف یہ کہ اس سے بے خبر رکھا جاتا، بلکہ اس کے برعکس اللہ اور اس کا رسول، دونوں ایسی باتیں فرما دیتے جن سے تیرہ سو برس تک ساری امت یہی سمجھتی رہی اور آج بھی سمجھ رہی ہے کہ حضورؐ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ اب اگر بفرض محال نبوت کا دروازہ واقعی کھلا بھی ہو اور کوئی نبی آ بھی جائے تو ہم بے خوف و خطر اس کا انکار کر دیں گے۔ خطرہ ہو سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی بازپرس ہی کا تو ہو سکتا ہے۔ وہ قیامت کے روز ہم سے پوچھے گا۔ تو ہم یہ سارا ریکارڈ برسرِ عدالت لا کر رکھ دیں گے جس سے ثابت ہو جائے گا کہ معاذ اللہ اس کفر کے خطرے میں تو اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت ہی نے ہمیں ڈالا تھا۔ ہمیں قطعاً کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ اس ریکارڈ کو دیکھ کر بھی اللہ تعالیٰ ہمیں کسی نئے نبی پر ایمان نہ لانے کی سزا دے ڈالیگا۔ لیکن اگر نبوت کا دروازہ فی الواقع بند ہے اور کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، اور اس کے باوجود کوئی شخص کسی مدعی کی نبوت پر ایمان لاتا ہے تو اسے سوچ لینا چاہیے کہ اس کفر کی پاداش سے بچنے کے لیے وہ کونسا ریکارڈ خدا کی عدالت میں پیش کر سکتا ہے جس سے وہ رہائی کی توقع رکھتا ہو۔ عدالت میں پیشی ہونے سے پہلے اسے اپنی صفائی کے مواد کا یہیں جائزہ لے لینا چاہیے اور ہمارے پیش کردہ مواد سے مقابلہ کر کے خود ہی دیکھ لینا چاہیے کہ جس صفائی کے بھروسے پر وہ یہ کام کر رہا ہے کیا ایک عقلمند آدمی اس پر اعتماد کر کے کفر کی سزا کا خطرہ مول لے سکتا ہے؟

دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ نبوت کوئی ایسی صفت نہیں ہے جو ہر اس شخص میں پیدا ہو جایا کرے جس نے عبادت اور عملِ صالح میں ترقی کر کے اپنے آپ کو اس کا اہل بنا لیا ہو۔ نہ یہ کوئی انعام ہے جو کچھ خدمات کے صلے میں عطا کیا جاتا ہو۔ بلکہ یہ ایک منصب ہے جس پر ایک

خاص ضرورت کی خاطر اللہ تعالیٰ کسی شخص کو مقرر کرتا ہے ۔ وہ ضرورت جب داعی ہوتی ہے تو ایک نبی اس کے لیے مامور کیا جاتا ہے ، اور جب ضرورت نہیں ہوتی یا باقی نہیں رہتی تو خواہ مخواہ انبیاء پر انبیاء نہیں بھیجے جاتے ۔ قرآن مجید سے جب ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ نبی کے تقرر کی ضرورت کن کن حالات میں پیش آئی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ صرف چار حالتیں ایسی ہیں جن میں انبیاء مبعوث ہوتے ہیں :

اوّل یہ کہ کسی خاص قوم میں نبی بھیجنے کی ضرورت اس لیے ہو کہ اس میں پہلے کبھی کوئی نبی نہ آیا تھا اور کسی دوسری قوم میں آئے ہوئے نبی کا پیغام بھی اس تک نہ پہنچ سکتا تھا ۔

دوم یہ کہ نبی بھیجنے کی ضرورت اس وجہ سے ہو کہ پہلے گزرے ہوئے نبی کی تعلیم بھلا دی گئی ہو یا اس میں تحریف ہو گئی ہو ، اور اس کے نقشِ قدم کی پیروی کرنا ممکن نہ رہا ہو ۔

سوم یہ کہ پہلے گزرے ہوئے نبی کے ذریعہ مکمل تعلیم و ہدایت لوگوں کو نہ ملی ہو اور تکمیلِ دین کے لیے مزید انبیاء کی ضرورت ہو ۔

چہارم یہ کہ ایک نبی کے ساتھ اس کی مدد کے لیے ایک اور نبی کی حاجت ہو ۔

اب یہ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی ضرورت بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد باقی نہیں رہی ہے ۔ قرآن خود کہہ رہا ہے کہ حضورؐ کو تمام دنیا کی ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا گیا ہے اور دنیا کی تمدنی تاریخ بتا رہی ہے کہ آپ کی بعثت کے وقت سے مسلسل ایسے حالات موجود رہے ہیں کہ آپ کی دعوت سب قوموں کو پہنچ سکتی تھی اور ہر وقت پہنچ سکتی ہے ۔ اس کے بعد الگ الگ قوموں میں انبیاء آنے کی کوئی حاجت باقی نہیں رہتی ۔ قرآن اس پر بھی گواہ ہے اور اس کے ساتھ حدیث و سیرت کا پورا ذخیرہ اس امر کی شہادت دے رہا ہے کہ حضورؐ کی لائی ہوئی تعلیم بالکل اپنی صحیح صورت میں محفوظ ہے ۔ اس میں مسخ و تحریف کا کوئی عمل نہیں ہوا ۔ جو کتاب آپ لائے تھے اس میں ایک لفظ کی بھی کمی و بیشی آج تک نہیں ہوئی ، نہ قیامت تک ہو سکتی ہے ۔ جو ہدایت آپ نے اپنے قول و عمل سے دی اس کے تمام آثار آج بھی اس طرح

ہمیں مل جاتے ہیں کہ گویا ہم آپ کے زمانے میں موجود ہیں۔ اس لیے دوسری ضرورت بھی ختم ہو گئی۔ پھر قرآن مجید یہ بات بھی صاف صاف کہتا ہے کہ حضورؐ کے ذریعہ سے دین کی تکمیل کر دی گئی ہے۔ لہٰذا تکمیلِ دین کے لیے بھی اب کوئی نبی درکار نہیں رہا۔ اب رہ جاتی ہے چوتھی ضرورت، تو اگر اس کے لیے کوئی نبی درکار ہوتا تو وہ حضورؐ کے زمانے میں آپ کے ساتھ مقرر کیا جاتا۔ ظاہر ہے کہ جب وہ مقرر نہیں کیا گیا تو یہ وجہ بھی ساقط ہو گئی۔ اب ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ پانچویں وجہ کونسی ہے جس کے لیے آپ کے بعد ایک نبی کی ضرورت ہو؟ اگر کوئی کہے کہ قوم بگڑ گئی ہے اس لیے اصلاح کی خاطر ایک نبی کی ضرورت ہے، تو ہم اس سے پوچھیں گے کہ محض اصلاح کے لیے نبی دنیا میں کب آیا ہے کہ آج صرف اس کام کے لیے وہ آئے؟ نبی تو اس لیے مقرر ہوتا ہے کہ اس پر وحی کی جائے، اور وحی کی ضرورت یا تو کوئی نیا پیغام دینے کے لیے ہوتی ہے، یا پچھلے پیغام کو تحریفات سے پاک کرنے کے لیے۔ قرآن اور سنتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے محفوظ ہو جانے اور دین کے مکمل ہو جانے کے بعد جب وحی کی سب ممکن ضرورتیں ختم ہو چکی ہیں تو اب اصلاح کے لیے صرف مصلحین کی حاجت باقی ہے نہ کہ انبیاء کی۔

تیسری قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ نبی جب بھی کسی قوم میں آئے گا فوراً اس میں کفر و ایمان کا سوال اٹھ کھڑا ہوگا۔ جو اس کو مانیں گے وہ ایک امت قرار پائیں گے اور جو اس کو نہ مانیں گے وہ لامحالہ دوسری امت ہوں گے۔ ان دونوں امتوں کا اختلاف محض فروعی اختلاف نہ ہوگا بلکہ ایک نبی پر ایمان لانے اور نہ لانے کا ایسا بنیادی اختلاف ہوگا جو انہیں اس وقت تک جمع نہ ہونے دیگا جب تک ان میں سے کوئی ایک اپنا عقیدہ نہ چھوڑ دے۔ پھر ان کے لیے عملاً بھی ہدایت اور قانون کے ماخذ الگ الگ ہوں گے، کیونکہ ایک گروہ اپنے تسلیم کردہ نبی کی پیش کی ہوئی وحی اور اس کی سنت سے قانون لیگا اور دوسرا گروہ اس کے ماخذِ قانون ہونے کا سرے سے منکر ہوگا۔ اس بنا پر ان کا ایک مشترک معاشرہ بن جانا کسی طرح بھی ممکن نہ ہوگا۔ ان حقائق کو اگر کوئی شخص نگاہ میں رکھے تو اس پر یہ بات بالکل واضح ہو جائے گی کہ ختم نبوت

اے لوگو جو ایمان لاتے ہو، اللہ کو کثرت سے یاد کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہو۔[۷۸] وہی ہے جو تم پر رحمت فرماتا ہے اور اس کے ملائکہ تمہارے لیے دعائے رحمت کرتے ہیں تاکہ وہ تمہیں تاریکیوں سے روشنی میں نکال لائے۔ وہ

امتِ مسلمہ کے لیے اللہ کی ایک بہت بڑی رحمت ہے جس کی بدولت ہی اس امت کا ایک دائمی اور عالمگیر برادری بننا ممکن ہوا ہے۔ اس چیز نے مسلمانوں کو ایسے ہر بنیادی اختلاف سے محفوظ کر دیا ہے جو ان کے اندر مستقل تفرقے کا موجب ہو سکتا ہو۔ اب جو شخص بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا ہادی و رہبر مانے اور ان کی دی ہوئی تعلیم کے سوا کسی اور ماخذِ ہدایت کی طرف رجوع کرنے کا قائل نہ ہو، وہ اس برادری کا فرد ہے اور ہر وقت ہو سکتا ہے۔ یہ وحدت اس امت کو کبھی نصیب نہ ہو سکتی تھی اگر نبوت کا دروازہ بند نہ ہو جاتا کیونکہ ہر نبی کے آنے پر یہ پارہ پارہ ہوتی رہتی۔ عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ایک عالمگیر اور مکمل دین دے دینے اور اس کو مسخ و تحریف سے محفوظ کر دینے کے بعد ختمِ نبوت کا اعلان ہونا ہی چاہیے تھا تاکہ اس دین پر جو امت قائم ہو وہ بار بار کی بلاضرورت شکست و ریخت سے محفوظ رہے۔

۷۸ اس سے مقصود مسلمانوں کو یہ تلقین کرنا ہے کہ جب دشمنوں کی طرف سے اللہ کے رسول پر طعن و تشنیع کی بوچھاڑ ہو رہی ہو اور دینِ حق کو زک پہنچانے کے لیے ذاتِ رسول کو ہدف بنا کر پروپیگنڈے کا طوفان برپا کیا جا رہا ہو، ایسی حالت میں اہلِ ایمان کا کام نہ تو یہ ہے کہ ان بیہودگیوں کو اطمینان کے ساتھ سنتے رہیں، اور نہ یہ کہ خود بھی دشمنوں کے پھیلائے ہوئے شکوک و شبہات میں مبتلا ہوں، اور نہ یہ کہ جواب میں ان سے گالم گلوچ کرنے لگیں، بلکہ ان کا کام یہ ہے کہ عام دنوں سے بڑھ کر اس زمانے میں خصوصیت کے ساتھ اللہ کو اور زیادہ یاد کریں۔ "اللہ کو کثرت سے یاد کرنے" کا مفہوم حاشیہ ۶۳ میں بیان کیا جا چکا ہے۔ صبح و شام تسبیح کرنے سے مراد دائماً تسبیح کرتے رہنا ہے۔ اور تسبیح کے معنی اللہ کی پاکیزگی بیان کرنے کے ہیں نہ کہ دانوں والی تسبیح پھرانے کے۔

مومنوں پر بہت مہربان ہے۔[۷۹] جس روز وہ اس سے ملیں گے اُن کا استقبال سلام سے ہوگا[۸۰] اور اُن کے لیے اللہ نے بڑا باعزت اجر فراہم کر رکھا ہے۔

۷۹؎ اِس سے مقصود مسلمانوں کو یہ احساس دلانا ہے کہ کفار و منافقین کی ساری جلن اور کڑھن اُس رحمت ہی کی وجہ سے ہے جو اللہ کے اس رسول کی بدولت تمہارے اُوپر ہوئی ہے۔ اُسی کے ذریعہ سے ایمان کی دولت تمہیں نصیب ہوئی، کفر و جاہلیت کی تاریکیوں سے نکل کر تم اسلام کی روشنی میں آئے اور تمہارے اندر یہ بلند اخلاقی و اجتماعی اوصاف پیدا ہوئے جن کے باعث تم علانیہ دوسروں سے برتر نظر آتے ہو۔ اِسی کا غصہ ہے جو حاسد لوگ اللہ کے رسول پر نکال رہے ہیں۔ اس حالت میں کوئی ایسا رویہ اختیار نہ کر بیٹھنا جس سے تم خدا کی اس رحمت سے محروم ہو جاؤ۔

صلوٰۃ کا لفظ جب علیٰ کے صلے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کے حق میں استعمال ہوتا ہے تو اس کے معنی رحمت، مہربانی، اور شفقت کے ہوتے ہیں۔ اور جب ملائکہ کی طرف سے انسانوں کے حق میں استعمال ہوتا ہے تو اس کے معنی دعائے رحمت کے ہوتے ہیں، یعنی ملائکہ انسانوں کے حق میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ تو ان پر فضل فرما اور اپنی عنایات سے انہیں سرفراز کر۔ ایک مفہوم یصلی علیکم کا یہ بھی ہے کہ یشیع عنکم الذکر الجمیل فی عباد اللہ یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے بندوں کے درمیان ناموری عطا فرماتا ہے اور تمہیں اس درجہ کو پہنچا دیتا ہے کہ خلق خدا تمہاری تعریف کرنے لگتی ہے اور ملائکہ تمہاری مدح و ثنا کے چرچے کرتے ہیں۔

۸۰؎ اصل الفاظ ہیں تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ "ان کا تحیہ اُس سے ملاقات کے روز سلام ہوگا"۔ اس کے تین مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ خود السلام علیکم کے ساتھ ان کا استقبال فرمائیگا جیسا کہ سورۂ یٰس میں فرمایا سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ۔ دوسرے یہ کہ ملائکہ ان کو سلام کرینگے، جیسے سورۂ نحل میں ارشاد ہوا اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ "جن لوگوں کی روحیں ملائکہ اس حالت میں قبض کرینگے کہ وہ پاکیزہ لوگ تھے اُن سے وہ کہیں گے کہ سلامتی ہو تم پر، داخل ہو جاؤ جنت میں اپنے اُن نیک اعمال کی بدولت جو تم دنیا میں کرتے تھے" (آیت ۳۲)۔ تیسرے یہ کہ وہ خود آپس میں ایک دوسرے کو سلام کریں گے جیسے سورۂ یونس میں فرمایا دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ "وہاں ان کی صدا یہ ہوگی کہ خدایا، پاک ہے تیری ذات، ان کا تحیہ ہوگا سلام، اور اُن کی تان ٹوٹے گی اس بات پر کہ ساری تعریف اللہ رب العٰلمین ہی کے لیے ہے" (آیت ۱۰)۔

نبوّت کی ضرورت

عبدالحمید صدیقی

(۲)

ایک نبی کی اصلاحی کوششیں متصوف کے گیان دھیان سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں اور اُن کا دائرۂ کار بھی متصوف کے دائرہ کار سے بہت زیادہ وسیع ہوتا ہے متصوف کی جدوجہد کا کل مقصود یہی ہے کہ وہ ریاضت کے ذریعہ ایک قسم کے روحانی سرور سے لطف اندوز ہوتا رہے اور جو لوگ اُس کے زیراثر آئیں یا اپنے آپ کو اُس سے وابستہ کریں وہ انہیں بھی اُسی کیف و مستی سے لذت آشنا کر دے۔ اس کے مقابلے میں نبی کا کام بڑا وسیع اور صبر آزما ہوتا ہے۔ فکر و نظر کے زاویوں سے لیکر عملی زندگی کی معمولی سے معمولی جزئیات تک نبی اپنی پوری توجہ صرف کرتا ہے اور ان میں اس انداز سے تغیرات لاتا ہے کہ وہ ہر لحاظ سے تعلیمات الٰہی کے سانچوں میں ڈھل جائیں حیات انسانی کا کوئی گوشہ اور قلب و دماغ کا کوئی ریشہ ایسا نہیں ہوتا جہاں اُن تعلیمات کے اثرات نمایاں نہ ہونے پائیں۔ نبی ایک طرف بنی نوع انسان کو اس کائنات، اس کے خالق اور خود اپنی ذات کے بارے میں ایک صحیح نقطۂ نظر عطا کرتا ہے۔ پھر ان کے باہمی تعلق کو صحیح بنیادوں پر استوار کر کے اس کے فکری اور عملی مضمرات ذہن نشین کراتا ہے۔ اس کے بعد وہ تعمیر سیرت کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ دل و دماغ کے جس جس گوشہ میں باطل احساسات اور گمراہ کن تصورات کی جھاڑ جھنکار موجود ہو، اُس سے نفس انسانی کو پاک اور صاف کرتا ہے اور پھر اُس میں ایمان و یقین کے بیج بوتا ہے اور تقویٰ اور پرہیزگاری سے ان کی آبیاری کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اسی طرح دیکھتے دیکھتے سیرت و کردار کی لہلہاتی کھیتیاں تیار ہو جاتی ہیں۔

انفرادی اصلاح سے آگے بڑھ کر انبیاء علیہم السلام معاشرتی، سیاسی اور معاشی میدانوں

میں بھی ایک صالح انقلاب کے علمبردار ہوتے ہیں۔ وہ سوسائٹی سے ہر قسم کی جاہلانہ رسوم کا قلع قمع کرتے ہیں۔ انسانوں کو انسان کی بندگی سے نکال کر انہیں خدا کی بندگی اختیار کرنے کی نہ صرف تلقین کرتے ہیں بلکہ ایک ایسی اجتماعی زندگی کی داغ بیل بھی ڈالتے ہیں جس میں انسان کی بندگی کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ معاشرہ میں اونچ نیچ کے جو غلط امتیازات قائم ہوتے ہیں، انہیں ایک ایک کرکے مٹاتے ہیں اور انسان کی معاشی زندگی کو ہر قسم کی لوٹ کھسوٹ سے بچا کر عدل و انصاف کے اصولوں پر استوار کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ نوع انسانی کو صلح و جنگ کے نئے آئین اور نئے ضابطوں سے آشنا کرتے ہیں۔ الغرض حیاتِ انسانی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہوتا جہاں اُن کی تعلیمات کے گہرے اثرات مترتب نہ ہوں۔ وہ نوعِ انسانی کو ایسی زندگی بخش اقدار عطا کرتے ہیں جنہیں دیکھ کر ایک شخص فوراً اس بات کا اندازہ لگا سکتا ہے کہ یہ سب تعلیماتِ ربانی ہی کی کرشمہ سازیاں ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات اور اُن کے کارناموں کو ہم خارجی دنیا میں نہ صرف واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں بلکہ عقلِ سلیم کی میزان پر تول کر اُن کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن متصوفین کے جس گروہ کا ہم نے ذکر کیا ہے اُن کے کاموں کی عقل و خرد ممکن ہے کوئی دورراز کار تعبیر کرکے اُن کے لیے کوئی فلسفیانہ بنیاد فراہم کر سکے، مگر آج تک عقل کوئی ایسا پیمانہ ایجاد نہیں کر سکا جس سے اُن کی صحیح صحیح پیمائش ممکن ہو۔ متصوفین کا دائرۂ عمل چونکہ داخلی زندگی تک محدود ہے اور اُن کی تگ و تاز کا مقصد کیف و مستی کے حصول کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا اس لیے عقل اس کے بارے میں کوئی حکم نہیں لگا سکتی۔ یہ کیف و مستی متصوفین کی نظر میں زندگی کے اُن سربستہ اسرار میں سے ہے جن کی تحلیل دشوار ہے اور جن کی نزاکت اور لطافت علمی موشگافیوں کی متحمل نہیں ہو سکتی، یا یوں کہیے کہ خشک علمیت اُن کی عقدہ کشائی کی صلاحیت اور اہلیت نہیں رکھتی۔ اسی بنا پر اہلِ خرد کو اہلِ جنوں کا یہ طعنہ قدم قدم پر سننا پڑتا ہے

لہ یہ امر ملحوظ خاطر رہے کہ متصوفین سے مراد وہ مسلمان صوفیاء کرام نہیں جنہوں نے اسلامی تعلیمات کا پرچار

از بے خبری، بے خبراں معذورند
ذوقیست دریں بادہ کہ مستاں دانند

تصوف سراسر ایک داخلی کیفیت کا نام ہے، اس لیے اسے کسی معروضی معیار پر پرکھ کر اس کے صحیح اور غلط ہونے کا فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے۔ اس کے مقابلے میں انبیاء علیہم السلام نے نوعِ انسانی کو جو تعلیم دی ہے وہ اگر ایک طرف اُس کے فکر میں سلجھاؤ اور اس کے قلب میں طمانیت پیدا کرتی ہے تو دوسری طرف ایک ایسی تہذیب کا سنگِ بنیاد بھی رکھتی ہے جو انسان کی اجتماعی زندگی کو ہر قسم کی کشاکش سے پاک کر کے اُسے پُرسکون بناتی ہے۔ اس نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ تصوف کے اندر کسی تمدن کی تشکیل کی قطعاً کوئی صلاحیت سرے سے موجود ہی نہیں ہوتی۔ تاریخ کے اوراق اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ خالص روحانیت نے آج تک کسی محدود سے محدود رقبہ زمین میں کسی تمدنی زندگی کو جنم نہیں دیا۔

انبیاء علیہم السلام اور متصوفین کی تعلیمات کے درمیان تیسرا فرق یہ ہے کہ انبیاء کی تعلیمات میں ایک یقین اور وثوق ہوتا ہے وہ انسانیت کو ایمان و ایقان کی دولت سے سرفراز کرتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں متصوفین سے جو چیز انسان کو حاصل ہوتی ہے اُس کی حیثیت ایک وقتی تاثر یا قلبی کیفیت کی ہے، اُس میں وہ یقین مفقود ہوتا ہے جسے تعلیماتِ نبوی کی جان کہا جاسکتا ہے۔ اس امتیاز کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ تصوف کا تعلق جس حاسہ سے ہے وہ بہرحال ایک انسانی حاسہ ہی ہے، اسی طرح کمزور، محدود اور خطا پذیر جس طرح کہ انسان کے دوسرے حواس ہیں۔ اس لیے اس کے دائرہ عمل میں غلطی کا صدور ہر وقت ممکن ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو متصوفین کے مشاہدات میں بھی اُسی طرح ہم آہنگی ہوتی جو ہمیں انبیاء کی تعلیمات میں

۲۔ کیا اور جن کی اپنی زندگیاں اسلام کا نہایت ارفع و اعلیٰ نمونہ تھیں یہاں متصوفین کے جس گروہ سے بحث کی جارہی ہے وہ اُن اصحاب پر مشتمل ہے جو صرف گیان دھیان کو زندگی کا کمال سمجھتے ہیں اور زندگی اور اس کے عملی مسائل سے یکسر الگ ہو کر زندگی گزارنے کے عادی ہیں۔

نظر آتی ہے۔ مشہور عارف ربانی حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمہ نے اپنے مکتوبات میں اس امر کی مختلف طریقوں سے تصریح فرمائی ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ مشاہدۂ باطن صفائی نفس اور ایک ایسے اندرونی حاسہ کو بیدار کر دینے سے ممکن ہے، جو روحانیت اور ماوراء الطبیعیات کا اسی طرح ادراک کرتا ہے، جس طرح یہ ظاہری آنکھیں ظاہری چیزوں کا ادراک کرتی ہیں یہ اندرونی روشنی ریاضت، نفس کشی اور مراقبہ اور تفکر سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اس مشاہدہ باطن سے جو علم ہمیں حاصل ہوتا ہے وہ اس طرح کا یقینی علم نہیں جو نبوت کی بارگاہ سے ملتا ہے۔ اس میں وہ ساری خامیاں پائی جاتی ہیں جو علوم عقلی میں موجود ہیں۔ کیونکہ کشف یا مشاہدہ باطن کی بنیاد بھی ایک انسانی حاسہ ہی ہے جس کی کچھ حدود ہیں اور جس میں نفس انسانی کی کمزوریاں بالضرور شامل ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ اسی موضوع پر بحث کرتے ہوتے وہ فرماتے ہیں:

> "اب ہم اصل بات کو بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بعض اوقات مشاہدہ باطن میں بھی خطا ہو جاتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ صاحبِ کشف بعض قلبی واردات کو الہامی کیفیات سمجھ لیتا ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں بعض اوقات یہ دونوں کیفیات باہم ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح گڈمڈ ہو جاتی ہیں کہ صاحبِ کشف ان کے درمیان تمیز نہیں کر سکتا اور وہ غلطی سے ان ساری واردات کو الہامی خیال کر لیتا ہے۔ پس یہ بات ذہن نشین رہے کہ کشف و مراقبہ کے بعض اجزاء میں خطا ہونے کے باعث پورے علم میں ہی خطا کا احتمال باقی رہتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ صاحبِ کشف جو کچھ دیکھتا ہے اُس کی ظاہری شکل و صورت کو آخری اور قطعی سمجھ لیتا ہے حالانکہ یہ مکاشفہ اپنے مزاج کے اعتبار سے تاویل و تعبیر کا محتاج ہوتا ہے۔
>
> (مکتوباتِ امام ربانی دفتر اول مکتوب ۲۱۷)

متصوفین کے مقابلے میں جو تعلیم نوع انسانی کو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ ملتی ہے وہ ہر لحاظ سے مکمل و اکمل، اور ہر خطا سے یکسر پاک ہوتی ہے۔ اس سے انسان کو یقین

اور ایمان کی دولت ہاتھ آتی ہے اور وہ اس کائنات، اس کے خالق و مالک، خود اپنے مرتبہ و مقام کے متعلق یقینی علم حاصل کرتا ہے۔ یہ تعلیم اُسے ریب و تشکک کی بھول بھلیوں سے نکال کر اُس کے راستے کو عزم و یقین کی روشنی سے منور کرتی ہے۔ مجدد الف ثانیؒ نے ان دونوں قسم کی تعلیمات کی نوعیت میں جو اساسی فرق ہے اُس کی علت بھی بتائی ہے۔ اسی موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

"فرشتہ چونکہ خطا و نسیان سے پاک اور ان کمزوریوں سے مبرا ہوتا ہے جن کی وجہ سے ایک انسان غلطی کا ارتکاب کرتا ہے۔ اس بنا پر وہ یقیناً اعتماد کے لائق ہے اور اس کے پیش کردہ احکام وہم و خیال کی دستبرد سے محفوظ و مامون ہوتے ہیں . . . اس بنا پر یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی ہدایت و رہنمائی کے بغیر انسان تزکیۂ نفس کی حقیقت کو نہیں پا سکتا۔ اور وہ صفائی جو کافروں اور فاسقوں کو حاصل ہوتی ہے وہ نفس کی صفائی ہے نہ کہ قلب کی صفائی۔ وہ مراقبہ یا ریاضت جس کی بنیاد تعلیمات نبوی نہ ہو، اُس سے گمراہی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا اور خسران کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں آتا اور بعض ماوراء الطبیعیات چیزوں کا کشف جو گیان دھیان کے وقت کافروں اور فاسقوں کو حاصل ہوتا ہے وہ استدراج ہے جس سے مقصود ان لوگوں کی خرابی اور خسران ہے۔

(دفتر اول مکتوب ۲۶۶)

ایک دوسرے مقام پر وہ اسی حقیقت کو بڑے زوردار الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں:

"الغرض وہ چیزیں جن پر قطعیت کے ساتھ اعتماد کیا جا سکتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہی ہیں جن کا منزل من اللہ ہونا قطعی اور یقینی ہے۔ رشد و ہدایت کی یہ تعلیم خدا فرشتے کے ذریعہ انبیاء علیہم السلام پر نازل کرتا ہے اس بنا پر وہ ہر قسم کی خطا اور غلطی سے پاک ہوتی ہے۔

علماء کا اجماع اور مجتہدین کا اجتہاد بھی انہیں دو اصولوں کی طرف راجع ہے۔ ان چار شرعی اصولوں کے سوا اور جو کچھ بھی ہو خواہ وہ صوفیا کے علوم و معارف ہوں یا ان کے مکاشفے اور مراقبے۔ اگر یہ چیزیں مندرجہ بالا چاروں اصولوں کے مطابق ہوں تو وہ قابل قبول ہیں ورنہ مردود۔ "وجد و حال کو جب تک شرع کی میزان پر نہ تول لیا جائے، وہ ایک حبہ سے بھی کم اہمیت کا حامل ہے اور کشف و مراقبہ کو جب تک کتاب و سنت کی کسوٹی پر نہ پرکھ لیں اُس کی حیثیت مسِ خام سے بھی کم ہے"

"مشاہدہ و مراقبہ بذات خود مطلوب و مقصود نہیں بلکہ بعض لوگ ان کی مدد سے تعلیماتِ الٰہی کے بارے میں شرح صدر حاصل کرتے ہیں۔ رؤیتِ الٰہی کا وعدہ صرف آخرت کے لیے ہے اور حواس کی دنیا میں عام انسانوں کے لیے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ باقی رہیں وہ تجلّیات یا وہ مشاہدے جن پر صوفیاء کرام نازاں ہیں وہ درحقیقت ظلال یا شبیہ و مثال ہیں۔ حق تعالیٰ وراء الوراء ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ اگر ان مشاہدات اور تجلیات کی حقیقت پر سے نقاب کشائی کر دوں تو اس راہ کے مسافر کا ذوقِ طلب کم ہو گا اور ان کے جذبہ شوق پر افسردگی طاری ہو جائے گی لیکن دوسری طرف مجھے اس بات کا بھی خطرہ لاحق ہے کہ حقیقت کو جاننے کے باوجود اگر میں خاموش رہوں تو حق باطل سے ممیز نہ ہو گا ..... حضورؐ سرور دو عالم کو اس دنیا میں دیدارِ الٰہی نصیب ہوا اور وہ اپنی جگہ پر قائم رہے لیکن یہ سمجھ لینا چاہیے کہ آپ کے کامل تبعین میں سے جس کو بھی مشاہدہ باطن حاصل ہو اُس کی نوعیت دوسری ہو گی۔ وہ خدا کے نور کا پرتو تو ہو گا لیکن وہ رؤیت ظلال میں سے کسی ظل کے پردے میں ہو گی۔ صاحب کشف اس حقیقت کو سمجھے یا نہ سمجھے لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ جب موسیٰ کلیم اللہ جیسے جلیل القدر نبی دیدارِ الٰہی کی تاب نہ لا سکے اور وہ بیہوش ہو کر گر گئے تو پھر

عام انسانوں میں یہ قوت و طاقت کیسے ہو سکتی ہے کہ وہ باری تعالیٰ کی تجلی
کی تاب لا سکیں۔" (دفتر اول مکتوب ۲۱۷)

دنیائے اسلام کے مشہور مفکر سید رشید رضا مصری نے اپنی فاضلانہ تصنیف "الوحی المحمدی" میں وحی کی تعریف کرتے ہوئے اس حقیقت کی بڑے واضح الفاظ میں نشاندہی کی ہے کہ یقین، وثوق، قطعیت و حتمیت وحی الٰہی کی ضروری صفات ہیں۔ جو علم خالقِ کائنات اور غیب و شہود کے متعلق نوع بشری کو یقینی اور قابلِ اعتماد معلومات فراہم کرتا ہے وہ ہمیں وحی و الہام کے ذریعہ سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ معلومات کا یہی ایک ایسا سرچشمہ ہے جسے انسانی خواہشات و توہمات، اور انسانی عقل و فکر، اور اس کا مشاہدہ اور تجربہ اپنی فطری کمزوریوں کی وجہ سے گدلا نہیں کر سکتے۔ یہ ایک ایسا علم ہے جسے خطا و نسیان سے بالکل محفوظ و مامون رکھا گیا ہے۔ کیونکہ یہ کسی انسان کے ذہن کی پیداوار نہیں ہوتا بلکہ خداوند تعالیٰ کی حکمت بالغہ کا مظہر ہوتا ہے۔ سید رشید رضا مرحوم و مغفور وحی کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وحی وہ علم ہے جو کسی شخص کو پورے یقین اور وثوق کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بالواسطہ یا بلا واسطہ حاصل ہوتا ہو۔"

الوحی المحمدی کے فاضل مصنف نے اسی فصل میں اس باطل خیال کی بھی تردید کر دی ہے کہ انسان کی اپنی آرزوئیں و تمنائیں اور اس کے اپنے احساسات و افکار بسا اوقات الفاظ کے نایاب سانچوں میں ڈھل جاتے ہیں اور سطح بین آنکھیں انہیں وحی و الہام سے تعبیر کرنے لگتی ہیں۔ اس قسم کے نظریات رکھنے والے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ وحی بھی شاعری اور تصوف کی قسم کی کوئی چیز ہے جو انسان کی اپنی ذاتی صلاحیتوں اور قابلیتوں کا مظہر ہوتی ہے اور لوگ ان کی غیر معمولی برتری کی وجہ سے انہیں خدا کا کلام سمجھ بیٹھتے ہیں۔ چنانچہ سید رضا صاحب فرماتے ہیں:

"جو لوگ عالم غیب کے وجود کو نہیں مانتے یا محسوسات کی دنیا سے اس کے باہمی تعلق کے منکر ہیں ان کا دعویٰ یہ ہے کہ حضور سرورِ دو عالم کی اپنی معلومات، ان کے ذاتی افکار اور ان کی اپنی ہی تمناؤں اور آرزوؤں نے ان کے اندر ایک الہامی قوت پیدا کر دی تھی جو ان کی بصیرت اور عقل و فکر کی باطنی قوتوں سے غذا حاصل کرتی۔ یا آپ کی پوشیدہ اور بلند و بالا روحانی طاقتوں کا عکس آپ کی اعلیٰ و ارفع قوتِ متخیلہ پر پڑتا اور اس طرح آپ کے ذاتی اعتقادات و نظریات ہی آپ کی آنکھوں پر منعکس ہوتے مگر آپ یہ سمجھ لیتے کہ کوئی فرشتہ سامنے کھڑا ہے یا کانوں میں اس کی آواز سنتے اور یہ (خیالی فرشتہ) جو کچھ کہتا اسے قلب و دماغ میں محفوظ کر لیتے۔"

"ہمارے اور ان لوگوں کے درمیان بنیادی اختلاف یہی ہے کہ ہم شرعی وحی کو حضورؐ کے اپنے افکار و احساسات کا نتیجہ نہیں سمجھتے بلکہ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ وہ آسمان سے حضور پر اتاری گئی تھی اور اس وجہ سے وہ حضورؐ کے نفس سے کوئی خارج چیز ہے۔ وہ حضورؐ کی داخلی اور باطنی قوتوں کا مظہر نہیں بلکہ اسے اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کے قلب پر فرشتہ کے ذریعہ نازل فرمایا تھا جس طرح کہ قرآن مجید میں مذکور ہے (۲۶: ۱۹۲) وانه لتنزيل رب العالمين (۱۹۳) نزل به الروح الامين (۱۹۴) على قلبك لتكون من المنذرين (۱۹۵) بلسان عربي مبين۔"

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جس طرح وحی نازل ہونا شروع ہوئی، اس کا جو ذکر قرآن مجید اور احادیث میں ملتا ہے اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ علم کوئی اکتسابی نہ تھا جو آپ کی عقلی و فکری قوتوں اور مشاہدۂ باطن کے ذریعہ آپ کو حاصل ہوا بلکہ اسے اللہ تعالیٰ نے آپ کو خود عطا فرمایا تھا۔ حارثہ بن ہشام رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

سے دریافت کیا "اے رسولؐ خدا! آپ پر وحی کیسے آتی ہے۔ رسول اکرمؐ نے ارشاد فرمایا: کبھی یہ آواز جرس کی طرح سنائی دیتی اور یہ میرے لیے سب سے زیادہ سخت ہوتی ہے۔ جب فرشتہ جُدا ہو جاتا ہے تو میں اس کی بات پوری طرح محفوظ کر چکا ہوتا ہوں۔ کبھی فرشتہ انسانی پیکر میں جلوہ گر ہوتا۔ وہ مجھ سے ہمکلام ہوتا اور میں اس کی باتوں کو اچھی طرح یاد کر لیتا ہوں۔" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے سخت جاڑے میں آپ پر وحی نازل ہوتے دیکھی ہے وہ جب ختم ہوتی تھی تو حضورؐ کی پیشانی سے پسینہ بہتا تھا۔

اسی طرح ایک دوسری حدیث جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے، وحی کی ابتداء یوں بیان کی گئی ہے کہ حضورؐ نیند کی حالت میں سچے خواب دیکھتے تھے۔ جو خواب بھی آپ دیکھتے وہ صبح کی روشنی کی طرح صحیح ہوتے۔ پھر آپ کو تنہائی اور گوشہ نشینی مرغوب ہو گئی۔ چنانچہ آپ غارِ حرا میں تنہا اپنے اہل و عیال سے الگ تھلگ کئی دن اور کئی راتیں عبادت میں صرف کرتے۔ آپ اپنا کھانا خود ساتھ لے جاتے تھے جب وہ ختم ہو جاتا تھا تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لا کر دوبارہ کھانا لے جاتے یہاں تک کہ غارِ حرا میں حق آپ پر ظاہر ہو گیا یعنی ایک فرشتہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے کہا: پڑھیے۔ میں نے کہا: میں پڑھنا نہیں جانتا۔ اس نے پکڑ کر مجھے اس قدر زور سے بھینچا کہ میرا جسم ٹوٹنے لگا اور پھر کہا پڑھیے، میں نے کہا کہ میں پڑھنا نہیں جانتا۔ اس پر اس نے دوبارہ پکڑ کر مجھے زور سے بھینچا یہاں تک کہ میرا جسم ٹوٹنے لگا۔ پھر کہا: پڑھیے، میں نے کہا کہ میں پڑھنا نہیں جانتا۔ پھر تیسری بار اس نے مجھے زور سے بھینچا اور پھر مجھے الگ کر کے کہنے لگا: اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ۔ خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔

آپ اس واقعہ کے بعد دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ حضرت خدیجہؓ کے پاس تشریف لائے اور فرمایا "مجھے کمبل اڑھاؤ" آپ کو کمبل اوڑھا دیا گیا۔ جب آپ کی دہشت دور ہوئی تو آپ نے حضرت خدیجہ کو سارے واقعہ سے آگاہ فرمایا اور کہا

کہ مجھے اپنے بارے میں خوف لاحق ہو گیا ہے۔ حضرت خدیجہؓ نے کہا: ہرگز نہیں خدا آپ کو کبھی رُسوا نہ کرے گا، کیونکہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، بےکسوں کی دستگیری کرتے ہیں، تہی دستوں کی مدد فرماتے ہیں، مہمانوں کی خبر گیری کرتے اور لوگوں کی مصیبتوں میں اُن کے کام آتے ہیں۔[1]

اسی واقعہ کے تین سال بعد تک وحی کا سلسلہ منقطع رہا۔ اور پھر اس کا آغاز ہوا جابر بن عبداللہ انصاری نے سلسلہ وحی منقطع ہو جانے کے واقعہ کو بیان کرتے ہوئے بتایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا: ایک دفعہ میں جا رہا تھا کہ اچانک آسمان سے ایک آواز سنائی دی۔ میں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہی فرشتہ جو غارِ حرا میں میرے پاس آیا تھا آسمان و زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ میں اس سے خوفزدہ ہو گیا اور گھر لوٹ کر میں نے کہا "مجھے کمبل اڑھاؤ۔" اسی وقت خداوند تعالیٰ نے یہ وحی نازل فرمائی۔

یا ایھا المدثر . . . تا آخر والرجز فاھجر۔

وحی کی ان مختلف کیفیات کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ حضور سرورِ دو عالم پر وحی کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ نازل کیا گیا تھا وہ ان کی اپنی قلبی واردات یا ذہنی کیفیات کا پرتو نہ تھا۔ وحی کے آغاز کی جو احادیث امام بخاریؒ، امام مسلمؒ اور دوسرے محدثینؒ نے روایت کی ہیں اُن سے صاف پتہ چلتا ہے کہ حضورؐ کے سامنے جب پہلی بار فرشتہ نمودار ہوا تو حضورؐ خوفزدہ ہو گئے۔ اگر نبوت اُن کی باطنی صلاحیتوں اور قوتوں کا ہی عکس ہوتی تو انہیں متحیر ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ کیونکہ اس صورت میں فرشتہ کا وجود کوئی حیران و ششدر کرنے والی چیز نہ ہوتی بلکہ اُن کے منشا اور مرضی کے عین مطابق ہوتی۔ اس حالت میں وہ فرشتہ سے خوفزدہ ہونے کی بجائے اپنی طبیعت کو اُس سے بالکل مانوس پاتے۔ فرشتے کے پہلی بار سامنے آنے پر آپ کا خوف و ہراس اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ حضورؐ اپنی باطنی قوتوں اور صلاحیتوں کو اس غیر معمولی

---

[1] بخاری۔ باب بدء الوحی لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اور بلند و بالا مقام کے حصول کے لیے شعوری طور پر تیار نہ کر رہے تھے۔ اس لیے جب فرشتہ حضور کی خدمت میں پہلی مرتبہ حاضر ہوا تو آپ نے اُسے ایک غیر متوقع اور اجنبی چیز سمجھ کر اُس سے خوف محسوس کیا۔

کسی صحیح اور مرفوع حدیث میں یہ تحریر نہیں کہ آپ نبوت کے متوقع اور منتظر تھے، اگر اس قسم کی کوئی روایت ہوتی تو محدثین کرام اُسے ضرور نقل کرتے۔ قرآن مجید اور احادیث کے مطالعہ سے اس بات کا صاف پتہ چلتا ہے کہ حضور کو اس نعمت سے اچانک، بالکل غیر متوقع طور پر سرفراز فرمایا گیا۔ چنانچہ قرآن پاک میں اس امر کی تصریح کر دی گئی ہے۔

وما کنت ترجوا ان یلقی الیک الکتاب الا رحمۃ من ربک (۲۸ : ۸۶)

تمہیں اس امر کی امید نہ تھی کہ تم پر کتاب نازل کی جائے گی مگر یہ سب تمہارے پروردگار کی رحمت کی وجہ سے ہوا۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے تم پر جو کتاب نازل فرمائی ہے اور تمہیں نبوت جیسے ارفع و اعلیٰ منصب سے سرفراز فرمایا ہے اس میں تمہارے اپنے علم و عمل کا کوئی دخل نہیں ہے نہ تمہیں اس کی توقع تھی اور نہ ہی آرزو۔ یہ جو کچھ اعزاز تمہیں بخشا گیا وہ خالقِ کائنات کی رحمت کا کرشمہ ہے۔

علامہ رشید رضا مصری نے اس ضمن میں ایک نہایت ہی معنی خیز بات کہی ہے وہ فرماتے ہیں اگر نبوت حضور کے ذہنی اضطراب، داخلی ہیجان اور سوزشِ قلبی کا ہی نتیجہ ہوتی اور اسی وجہ سے آپ غارِ حرا میں دنیا سے الگ تھلگ رہ کر عبادت میں مصروف ہوئے، تو ان داخلی کیفیات کے نتیجے میں اُن کا ذہن رسا اور مضطرب دل کوئی زبردست سورۃ یا کوئی فصیح و بلیغ آیات تصنیف کرتا۔ اگر مستشرقین کی یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ ریگزاروں کی کھلی فضا نے آپ کے اندر وحدانیت کا احساس بیدار کیا اور آپ کی طبیعت کو کفر و شرک سے نفرت پیدا ہوئی، ستاروں کی خاموش فضاؤں نے آپ کے دل کے اندر

ایک طاقتور خالق کا خیال بٹھایا ۔ ظالم طبقوں کی ریشہ دوانیاں دیکھ کر آپ کے حساس دل کے اندر ارتعاش ہوا اور آپ نے ان پسے ہوئے لوگوں کی دستگیری کا عزم کیا۔ اگر حضور سرورِ دو عالم پر وحی کا نزول آپ کے ان احساسات کا ہی کرشمہ تھا تو پھر سب سے پہلے وہ سورتیں نازل ہوتیں جن میں ایمان و ایقان کے اصول و مبادی، توحید کا اثبات شرک اور بت پرستی کی زبردست مذمت، پادریوں اور راہبوں کی من گھڑت شریعت، خداوند تعالیٰ کو بیٹا پکڑنے کا ذکر، اور کفر و طغیان میں سرشار سرداروں کی دنیا اور آخرت میں تذلیل اور رسوائی کے تذکرے ہوتے جیسا کہ مفصل سورتوں بالخصوص ق والقرآن المجید، والذاریات، الطور، النجم، القمر، الحاقۃ النبا، میں ہیں ۔"

"مگر برخلاف اس کے ہوا یہ کہ آغاز وحی کے تین سال بعد تک نہ تو حضورؐ نے لوگوں کو کوئی سورۃ سنائی، اور نہ ہی کوئی دعوت دی اور نہ ہی اس دینی تحریک کا اپنے خاندان اور رفقاء سے کوئی تذکرہ کیا جس کا کہ بقول ان کے آپؐ کے دل میں خیال سمایا ہوا تھا۔ آپ نے اس دوران میں شرک کی ان خرافات کی بھی مذمت نہ کی جس نے آپ کے دل کو مضطرب اور پریشان کر رکھا تھا۔ اگر آپ اس قسم کی کوئی بات بیان فرماتے تو اسے بالضرور روایت کر دیا جاتا۔ اگر دوسرے لوگ یہ خدمت انجام نہ دیتے تو وہ مقدس لوگ تو اس کام کو بالضرور کرتے جو آپ سے گہرے طور پر وابستہ تھے مثلاً اہلِ خانہ میں سے حضرت خدیجہ، حضرت علی و زید بن حارث رضی اللہ عنہم، اور گھر سے باہر حضرت ابوبکر صدیقؓ جو عمر بھر آپ کے دلسوز رفیق اور فدائی رہے وحی کے التوا کے زمانے میں ان مقدس حضرات کا سکوت اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ان مغربی علماء نے "نفسیاتی اور ذاتی وحی کے لیے آپ کی تیاری اور دوسرے لوگوں سے مختلف معلومات لیکر انہیں وحی و الہام کا نام دینے کے جو من گھڑت قصے بیان کیے ہیں وہ سرتا پا لغو اور بے بنیاد ہیں ۔"

اس سلسلہ میں ایک اور چیز بھی ذہن نشین رہے کہ جو لوگ چالاکی اور عیاری سے، ایک لگے بندھے منصوبے کے تحت نبوت کا دعویٰ کرنے کے متمنی ہوتے ہیں اُن کے دعوے میں کبھی بھی اتنا عزم اور یقین نہیں ہوتا جتنا کہ ایک سچے نبی کے دعوے میں ہوتا ہے۔ ایک سچے نبی کو نبوت ملنے سے پہلے اپنے مقام و مرتبہ کا کچھ علم نہیں ہوتا اس لیے وہ اپنے متعلق کوئی دعویٰ نہیں کرتا لیکن جب اللہ تعالیٰ اُسے اس امر کی اطلاع دے دیتا ہے کہ اُسے نبوت کے لیے منتخب کر لیا گیا ہے تو پھر وہ اپنے متعلق کسی گومگو کی پالیسی کو اختیار نہیں کرتا۔ وہ پھر برملا لوگوں سے کہتا ہے کہ میں نبی ہوں اور میرے ماننے اور نہ ماننے پر ایمان و کفر کا مدار ہے۔ جو مجھ پر ایمان لائے گا وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہوگا اور جو میرا انکار کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم کر دیا جائے گا۔ یہ اعلان وہ بغیر کسی لاگ لپیٹ کے کرتا ہے اور اپنے اس موقف سے ذرہ برابر ہٹنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ ایک سچے نبی کے برعکس ایک متنبی کو اپنے مقام کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ اگر حالات سازگار ہوں تو وہ نبوت کا دعویٰ کر دیتا ہے اور انکار کرنے والوں کو کافر ٹھہراتا ہے لیکن جب حالات ذرا ناموافق دکھائی دیں تو فوراً اپنا موقف بدل دیتا ہے۔ چنانچہ دیکھیے انبیاء علیہم السلام کے بارے میں لوگوں کے دو ہی موقف رہے ہیں، یا تو انہوں نے اُن مقدس ہستیوں پر ایمان لا کر اسلام کا قلادہ اپنی گردنوں میں پہن لیا یا پھر انکار کر کے کفر کی راہ اختیار کی۔ کسی سچے نبی کے بارے میں لوگ کبھی ریب و تشکک میں مبتلا نہیں ہوئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبوت چونکہ باطنی قوتوں کا پرتو نہیں ہوتی بلکہ خداوند تعالیٰ کا عطیہ ہوتی ہے اس لیے نبی کو اپنے مرتبہ اور مقام کے بارے میں پورا الیقین و وثوق ہوتا ہے وہ نبوت کا دعویٰ حالات کی سازگاری یا ناسازگاری دیکھ کر نہیں کرتا بلکہ اللہ کے حکم کے مطابق دنیاوی مصلحتوں سے یکسر بے پروا ہو کر لوگوں سے کھلے بندوں کہتا ہے کہ میں نبی ہوں اور جو مجھ پر ایمان لائے گا وہ دنیا و آخرت میں فائز المرام ہوگا اور جو میرا انکار کرے گا وہ جہنم کی آگ میں جھونک دیا جائے گا۔ اس ایک موقف کے علاوہ وہ کوئی دوسرا

موقف اختیار نہیں کرتا۔ وہ اس معاملے میں کسی مداہنت اور اخفاء سے کام نہیں لیتا۔ وہ اپنے دعوے کا آغاز اسی ایک چیز سے کرتا ہے اور اسی دعوے پر قائم رہتے ہوئے اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملتا ہے۔ اس دعوے میں کسی قسم کی تدریج نہیں ہوتی۔

اس کے برعکس اگر آپ ایک جھوٹے نبی کے دعاوی کا تجزیہ کریں تو آپ کو اس کا کذب فوراً معلوم ہو جائے گا۔ اس کے موقف میں کوئی ٹھہراؤ اور قرار نہیں ہوتا۔ وہ اپنے مرتبہ اور مقام کے بارے میں بھی ایسی ایسی چالیں چلتا ہے جیسے کہ وہ شطرنج کی بازی کھیل رہا ہے پہلے ایک معمولی دعویٰ کر کے مخالفین کا ردعمل دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اگر حالات سازگار معلوم ہوئے تو پھر پہلے دعوے سے ذرا بلند دعویٰ کر کے لوگوں کے تاثرات کا اندازہ لگایا اور اس طرح عقل و احساس کی کوریلا وار لڑتے ہوئے اُن مقدس مقامات تک جا پہنچے جن کے بارے میں مسلم قوم کے احساسات انتہائی نازک ہیں۔ مثال کے طور پر پہلے خادم دین بننے اور دین کو دوسرے ادیان پر غالب کرنے کا غلغلہ بلند کیا۔ جب لوگوں کی نظریں اس کی شخصیت پر جمنے لگیں تو پیچھے سے یہ کہہ دیا کہ میں مجدد ہوں اور اللہ تعالیٰ مجھ سے براہ راست ہمکلام ہوتا ہے۔ جب عوام نے اسے بھی برداشت کر لیا تو پھر کہا میں ظلی نبی ہوں۔ اس پر جب لوگوں نے سنت و ... سے شروع کی تو پھر قدم پیچھے کی طرف لوٹاتے اور اپنے موقف سے ہٹ کر عوام کو خاموش کرنے کی کوشش کی پھر حالات جب ذرا اپنے حق میں سازگار معلوم ہوئے تو نبوت کا اعلان کر دیا لیکن اس دعوے پر کبھی بھی سختی کے ساتھ قائم نہ رہے۔ لوگوں کے انکار و احساسات کے ساتھ ہمیشہ آنکھ مچولی کھیلتے رہے اور عقیدتمندوں کے ذہنوں کو تاویلات کے گورکھ دھندوں میں ایسا الجھایا کہ وہ بیچارے زندگی کے بعد بھی اس امر کا فیصلہ نہ کر سکے کہ اس مدعی کو کس زمرہ میں شامل کیا جائے۔

ایک سچا نبی چونکہ اللہ تعالیٰ سے براہِ راست ہدایت حاصل کرتا ہے اس لیے اُس کے قلب و دماغ میں کسی قسم کا کوئی شک اور الجھاؤ نہیں ہوتا۔ اس کی ہر بات میں یقین اور وثوق سے

لبریز ہوتی ہے۔ حالات کی موافقت یا ناسازگاری اُس کے راستے میں بالکل حائل نہیں ہونے پاتی وہ اپنے متعلق اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ کیا ہے اور اسے کس منصب سے سرفراز کیا گیا ہے۔ اس منصب کے بارے میں اُسے کس حد تک یقین حاصل ہوتا ہے اس کا اندازہ حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کے ایک ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ قریشِ مکہ نے جب تنگ آکر حضورؐ کے چچا ابو طالب کے پاس آکر شکایت کی کہ آپ کا بھتیجا ہمارے معبودوں کو گالیاں دیتا ہے، ہمارے دین میں عیب نکالتا ہے اور ہمارے عقلمندوں کو بیوقوف بتاتا ہے اور ہمارے بزرگوں کو گمراہ ٹھہراتا ہے۔ لہٰذا یا تو اب آپ اسے اس کام سے باز کیجیے یا ہمیں اجازت دیجیے کہ ہم اسے سختی سے روک دیں۔ ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ اب ہم زیادہ مدت تک اس صورتِ حال کو برداشت نہیں کر سکتے۔ ابو طالب کفارِ مکہ کے اس چیلنج سے متاثر ہوئے اور کہا:

"اے میرے بھائی کے بیٹے! تمہاری قوم میرے پاس آئی ہے، اور اُس نے یہ باتیں کہی ہیں۔ جو عام لوگوں نے شکایتاً اس کے پاس پہنچائی تھیں۔ مجھ پر اور اپنی ذات پر رحم کھاؤ اور مجھ پر ایک ایسا بوجھ نہ ڈالو جس کا میں متحمل نہیں ہو سکتا۔

چچا کی یہ بے بسی حضورؐ کے پائے ثبات میں کوئی تزلزل نہ پیدا کر سکی کیونکہ انہیں اللہ تعالیٰ کی دستگیری پر کامل اور مکمل بھروسہ تھا اس لیے انہوں نے پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ چچا سے کہا

یا عم، واللہ لو وضعوا الشمس	چچا جان، اللہ کی قسم اگر یہ لوگ میری دائیں جانب
فی یمینی، والقمر فی یساری علی ان اترک	سورج اور بائیں جانب چاند بھی رکھ دیں کہ میں اس
ھذا الامر حتی یظھرہ اللہ أو اھلک	دعوت سے دستبردار ہو جاؤں، تو ایسا ہرگز نہیں
فیہ ما ترکتہ [1]	ہو سکتا۔ میں اس فرض کی بجا آوری میں اُس وقت

تک منہمک رہوں گا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ خود اس دعوت کو غالب کر دے یا میں اس تگ و دو میں جان جانِ آفریں کے حوالہ کر دوں۔

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد اول ص ۲۶۶

یہ ہے وہ حیرت انگیز شعور و ادراک جو نبی کو اپنے منصب اور موقف کے بارے میں ہوتا ہے اور یہ ہے وہ زبردست وثوق و اعتماد جو مخبرِ صادق خدائے لم یزل پر رکھتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام سے چونکہ خداوند تعالیٰ خود ہمکلام ہوتا ہے اس لیے ان کے دل و دماغ کے کسی گوشہ میں تذبذب کا کوئی شائبہ بھی پیدا نہیں ہونے پاتا۔

حضور کے اس فرمان سے، کہ اگر "میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی رکھ دیے جائیں تو میں اپنی دعوت سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہوں"۔ جہاں ایک طرف حضورؐ کے غیر معمولی عزم و استقلال کا اظہار ہوتا ہے وہاں اس میں ایک اور لطیف نکتے کی طرف نہایت بلیغانہ انداز میں اشارہ کیا گیا ہے یعنی مجھے اللہ تعالیٰ نے جن دلائل و براہین سے نوازا ہے وہ میرے نزدیک سورج اور چاند سے بھی زیادہ منوّر اور واضح ہیں۔ ان کے مقابلے میں شمس و قمر کا نور بالکل ماند ہے۔ براہینِ الٰہیہ سامنے آجانے کے بعد، اور خالقِ کائنات کے سورج اور چاند سے زیادہ روشن دلائل دیکھتے ہوئے میرے لیے یہ کیونکر ممکن ہے کہ میں محض خلق کی مخالفت کے خوف سے انہیں پس پشت ڈال دوں۔

حضور سرورِ عالم کو خداوند تعالیٰ کے ارشادات اور اس کے وعدوں پر کس حد تک بھروسہ تھا اس پر حضورؐ کی پوری زندگی شاہد ہے۔ جب ہم حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کے مختلف واقعات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کہ ایک شخص کے سامنے سے غیب کے سارے حجابات دور کر دیے گئے ہیں اور وہ ایک قادرِ مطلق خالق کی ذات کو اپنی آنکھوں سے خود دیکھ رہا ہے۔ ایک متصوّف بھی ذاتِ حق کے مشاہدہ کا دعویٰ کرتا ہے لیکن اسے اس مشاہدہ پر اتنا وثوق و اعتماد نہیں ہوتا جتنا کہ ایک نبی کو حاصل ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام اور خالق کے درمیان پیغام رسانی کا جو سلسلہ قائم ہوتا ہے وہ چونکہ خود اللہ تعالیٰ اپنی حفاظت اور نگرانی میں قائم کرتا ہے اس لیے اس میں نہ تو انبیاء علیہم السلام کی داخلی کیفیات اور قلبی واردات دخیل ہونے پاتی ہیں اور نہ ہی ان کا ذاتی مشاہدہ اور مطالعہ وحی و الہام پر کسی طرح اثر انداز

ہوتا ہے خداوند تعالیٰ پر اس غیر معمولی وثوق و اعتماد کے واقعات سے سیرت کی ساری کتب بھری پڑی ہیں۔ ہم یہاں بطور مثال صرف ایک واقعہ نقل کرتے ہیں۔

حضورؐ کی جان مسلمانوں کو کس حد تک عزیز تھی اُس کا اندازہ ہر وہ مسلمان کر سکتا ہے جس نے حضورؐ اور اُن کے جان نثار صحابہ کے باہمی تعلق کا ایک سرسری سا جائزہ بھی لیا ہے۔ حضورؐ کے رفقاء کار اُن کے دلسوز فدائی تھے اور حضورؐ کے معاملے میں ان کے احساسات اتنے نازک تھے کہ دشمنوں کے نرغے میں گھر کر بھی جب ان سے یہ کہا جاتا کہ کیا تم اس بات کو گوارا کرتے ہو کہ تمہاری جگہ تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خون گرا دیا جاتے تو انہوں نے غیر معمولی جرأت اور دلسوزی کے ساتھ فوراً یہ کہا کہ ظالمو! تم تو میری جان بخشی کے صلے میں حضورؐ کے مقدس خون گرانے کے متعلق بات کر رہے ہو مجھے یہ بات تو گوارا ہے کہ دشمنوں میرا سر تن سے جدا کر دے اور وہ خاک و خون میں تڑپنے لگے لیکن مجھے یہ بات کبھی گوارا نہیں ہو سکتی کہ میری جان کے بدلے حضورؐ کے پائے مبارک میں ایک کانٹا بھی چبھ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ حضورؐ کی جان کی آپ کے صحابہ ہر وقت حفاظت اور پاسبانی کرتے رہے۔ چنانچہ سیرت کی کتب میں درج ہے کہ معرکہ بدر میں جب ایک رات حضور سرور دو عالم آرام فرما رہے تھے تو سعد بن معاذ نے چوکیداری کا فرض انجام دیا، احد کے دن محمد بن مسلمہ نے یہ خدمت انجام دی۔ خندق کے دن زبیر ابن العوام نے حضورؐ کے خیمہ کے گرد پہرہ دیا۔ ان اصحاب کے علاوہ ابن بشیر اور بہت سے دوسرے خوش نصیب لوگ ایسے تھے جنہیں یہ سعادت نصیب ہوئی مگر جس وقت حضورؐ پر یہ آیت نازل ہوئی وَاللّٰہُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ یعنی اب اللہ خود تمہاری جان کی حفاظت کرے گا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے درمیان تشریف لائے اور اپنے جان نثاروں کو اس کے متعلق مطلع کر دیا اور جو لوگ اس خدمت پر مامور تھے اُن سے کہا: اب آپ تشریف لے جائیں کیونکہ اللہ نے میری حفاظت کا خود ذمہ لے لیا ہے[۱]۔

---

[۱] زاد المعاد جلد اول صفحہ ۶۵

خدا کے ارشاد پر یہ غیر معمولی یقین اور اعتماد اُسی شخص کے قلب و دماغ میں پیدا ہو سکتا ہے جس کا خداوند تعالیٰ سے براہِ راست تعلق قائم ہو چکا ہو۔ جو مقدس ذات خداوند تعالیٰ کے وعدے پر اپنی جان کی حفاظت اور نگرانی اس کے ہاتھ میں براہِ راست دینے پر آمادہ ہو جاتی ہے اور اپنے خدمت گزاروں سے صاف طور پر کہہ دیتی ہے کہ وہ اب اُس کے لیے فکر مند نہ ہوں، اس کے متعلق عقل یہ باور نہیں کر سکتی کہ وہ غلطی سے اپنے ذاتی احساسات کو الہامی کیفیات سمجھ سکے گی۔ تاریخ کے اوراق نے اس امر کی شہادت بھی دی ہے کہ خداوند تعالیٰ کا دعویٰ پورا ہو کر رہا، اور اللہ کا رسول دشمنوں کے نرغے میں گھر کر بھی محفوظ و مامون رہا اور اس کی جان کی حفاظت، اور پاسبانی خود خالقِ کائنات نے کی۔ حضورؐ کے خداوند تعالیٰ پر اس غیر معمولی اعتقاد کا اعتراف بڑے بڑے متعصب مستشرقین تک نے کیا ہے:

"ہم خواہ انہیں نبی کہیں یا شاعر لیکن ہم ایک بات ضرور محسوس کرتے ہیں کہ جو الفاظ اُن کی زبان فیض ترجمان سے ادا ہوتے وہ کسی عام انسان کے الفاظ نہیں ہو سکتے۔ یوں نظر آتا ہے کہ اُن الفاظ کا تعلق اشیاء کی اصل حقیقت سے تھا اس کی وجہ یہ ہے کہ حضورؐ کا دنیا کی سب سے بڑی حقیقت (یعنی ذات باری تعالیٰ) سے براہِ راست تعلق قائم ہو چکا تھا۔

(ڈمار اندری "محمدؐ" لندن ۱۹۳۶ صفحہ ۲۴۷)

"حضورؐ خدائے واحد کے رسول تھے، اور اپنے اس مرتبہ اور منصب کا شعور و ادراک انہیں زندگی کے ہر لمحہ حاصل رہا، یہ حقیقت کبھی بھی ان کی نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائی۔ اور جو پیغام وہ خدا کی طرف سے لیکر دنیا میں تشریف لائے تھے وہ ہمیشہ اُن کے سامنے رہا۔ (لین پول دی پرافٹ اینڈ اسلام صفحہ ۳۹)

(باقی)

رسائل و مسائل

کیا جِن انسانوں ہی کی ایک قسم ہے؟

سوال ۔ یہ بات غالباً آپ کے علم میں ہو گی کہ قرآن کے بعض نئے مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ قرآن میں جِنّ و انس سے مراد دو الگ الگ قسم کی مخلوق نہیں ہے بلکہ جنوں سے مراد دیہاتی اور انسانوں سے مراد شہری لوگ ہیں ۔ آج کل ایک کتاب ابلیس و آدم زیرِ مطالعہ ہے ۔ اس میں دیگر جملہ دُور از کار تاویلات سے قطع نظر ایک جگہ استدلال قابلِ غور معلوم ہوا ۔ مصنف لکھتے ہیں : "سورۂ اعراف (۷) کی آیت میں بنی آدم سے کہا گیا ہے کہ رسول تم میں سے (مِنْکُمْ) آئیں گے اور سورۂ انعام (۶) کی آیت میں جن و انس کے گروہ سے کہا گیا ہے کہ رسول تم میں سے (مِنْکُمْ) آئے تھے ۔ قرآن کریم میں جنات (آتشیں مخلوق) کے کسی رسول کا ذکر نہیں ۔ تمام رسولوں کے متعلق حصر سے بیان کیا ہے کہ وہ انسان بنی آدم تھے اور انسانوں میں سے مرد ۔ اس لیے جب "گروہ جن و انس" سے کہا گیا کہ تم میں سے (مِنْکُمْ) رسول آئے تھے تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ "گروہ جن و انس" سے مقصود بنی آدم ہی کی دو جماعتیں ہیں ۔ اس سے انسانوں سے الگ کوئی اور مخلوق مراد نہیں ہے ۔" براہِ کرم واضح کریں کہ یہ استدلال کہاں تک صحیح ہے ۔ اگر جن کوئی دوسری مخلوق ہے اور اس میں سے رسول نہیں مبعوث ہوئے تو پھر مِنْکُمْ کے خطاب میں وہ کیسے شریک ہو سکتے ہیں؟

جواب : جنوں کے بارے میں آیت اَلَمْ یَاْتِکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ کی نقل کردہ تفسیر سے آپ کے

ذہن میں جو الجھن پیدا ہو گئی ہے اس کو آپ خود حل کر سکتے ہیں اگر دو باتوں پر غور کریں۔

اوّل یہ کہ اگر دو گروہوں کو ایک مجموعہ کی حیثیت سے خطاب کیا جا رہا ہو، اور کوئی ایک چیز اُن میں سے کسی ایک گروہ سے متعلق ہو، تو اس مجموعی خطاب کی صورت میں کیا اس چیز کو پورے مجموعہ کی طرف منسوب کرنا غلط ہے؟ اگر کسی عبارت میں اُسے مجموعے کی طرف منسوب کر دیا گیا ہو تو کیا اس سے یہ استدلال کرنا صحیح ہو گا کہ یہ سرے سے دو گروہوں کا مجموعہ ہی نہیں ہے بلکہ ایک گروہ ہے؟ فرض کیجیے کہ ایک مدرسے میں کئی کلاسیں ہیں اور قصور اُن میں سے ایک کلاس نے کیا ہے۔ مگر ہیڈ ماسٹر تادیباً تمام کلاسوں کو اکٹھا کر کے ان سے خطاب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "اے مدرسے کے بچو، تم میں سے کچھ لڑکوں نے یہ قصور کیا ہے" تو کیا اس سے یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ اس مدرسے میں سرے سے کلاسیں ہیں ہی نہیں بلکہ ایک ہی کلاس پائی جاتی ہے؟ اگر یہ استدلال صحیح نہیں ہے تو نقل کردہ استدلال بھی صحیح نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ جن اور انس کے مجموعے کو خطاب فرما رہا ہے۔ اس مجموعے میں سے ایک گروہ کے اندر انبیاء آئے ہیں، لیکن انبیاء نے تبلیغ دین دونوں گروہوں میں کی ہے اور ان پر ایمان لانے کے لیے دونوں گروہ مکلف ہیں۔ اس لیے دونوں گروہوں سے مجموعی خطاب کرتے ہوئے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ تم میں سے انبیاء آتے تھے۔ محض اس طرز خطاب سے یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ یہ دونوں گروہ الگ الگ نہیں ہیں بلکہ ایک ہی جنس سے تعلق رکھتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب قرآن مجید متعدد مقامات پر صاف صاف یہ بتا چکا ہے کہ جن اور انس دو بالکل الگ قسم کی مخلوق ہیں، تو پھر محض اَلَمْ یَاْتِکُمْ سے یہ مفہوم نکالنا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا کہ جن بھی انسانوں ہی میں سے ہیں۔ مثال کے طور پر حسب ذیل آیات کو لیجیے۔

(۱) وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ وَالْجَانَّ خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُومِ (الحجر آیت ۲۶-۲۷)

ہم نے انسان کو سڑے ہوئے گارے کی پختہ مٹی سے پیدا کیا اور اس سے پہلے جنوں کو ہم نے آگ کی لپٹ سے پیدا کیا تھا۔

(۲) خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ (الرحمٰن)

انسان کو ٹھیکرے کی طرح بجتی ہوئی پختہ مٹی سے پیدا کیا اور جنوں کو آگ کی لپٹ سے۔

(۳) وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ (الانعام)

اور لوگوں نے اللہ کے لیے جن شریک ٹھیرا لیے۔

(۴) وَاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ (الجن، ۶)

اور یہ کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں سے کچھ لوگوں کی پناہ مانگا کرتے تھے۔

(۵) وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ (الکہف، ۵۰)

اور جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ سجدہ کرو آدم کو تو انہوں نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے نہ کیا۔ وہ جنوں میں سے تھا اور وہ اپنے رب کے حکم کی خلاف ورزی کر گیا۔

(۶) قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ (الاعراف، ۱۲)

[illegible] میں اس سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے [illegible] سے پیدا کیا ہے اور اسے مٹی سے۔

(۷) يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ ۔ ۔ ۔ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ (الاعراف، ۲۷)

اے بنی آدم، شیطان ہرگز تمہیں اس طرح فتنے میں مبتلا نہ کر پائے جس طرح اس نے تمہارے والدین کو جنت سے نکلوایا تھا ۔ ۔ ۔ وہ اور اس کا قبیلہ تم کو ایسی جگہ سے دیکھتا ہے جہاں سے تم اس کو نہیں دیکھ سکتے۔

(۸) يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً (النساء، ۱)

اے انسانو، ڈرو اپنے اس رب سے جس نے تمہیں ایک متنفس سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور بہت سی عورتیں (دنیا میں) پھیلا دیں۔

(۹) وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا

اور جب تیرے رب نے ملائکہ سے کہا کہ میں سڑی ہوئی مٹی کے پختہ گارے سے ایک بشر بنانے والا ہوں تو جب میں اسے پورا پورا بنا دوں اور اس میں اپنی

لَهٗ سٰجِدِیْنَ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ اِلَّآ اِبْلِیْسَ اَبٰٓی اَنْ یَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِیْنَ۔ (الحجر، ۲۸-۳۱)

طرف روح پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جانا پس ملائکہ سب کے سب سجدہ ریز ہو گئے بجز ابلیس کے کہ اس نے سجدہ کرنے والوں میں شامل ہونے سے انکار کر دیا

ان آیات سے چند باتیں بالکل واضح ہو جاتی ہیں:

اوّل یہ کہ انسان، بشر، الناس اور بنی آدم قرآن میں ہم معنی الفاظ ہیں۔ اولادِ آدم کے سوا قرآن مجید کسی انسانی مخلوق کا قطعاً ذکر نہیں کرتا۔ اس کی رُو سے نہ کوئی انسان آدم سے پہلے موجود تھا اور نہ آدم کی اولاد کے ماسوا دنیا میں کبھی انسان پایا گیا ہے یا اب پایا جاتا ہے۔ یہ نوع آدم علیہ السلام اور ان کی بیوی ہی سے پیدا ہوئی ہے اور اس کی تخلیق مٹی سے کی گئی ہے۔

دوم یہ کہ جن ایک دوسری نوع ہے جس کا مادۂ تخلیق ہی نوعِ انسانی سے مختلف ہے۔ نوعِ انسان مٹی سے بنی ہے اور نوعِ جن آگ سے، یا آگ کی پھونک سے۔

سوم یہ کہ نوعِ جن نوعِ انسان کی تخلیق سے پہلے موجود تھی۔ اس نوع کے نمائندہ فرد کو نوعِ انسانی کے پہلے فرد کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا اور اس نے انکار کیا تھا۔ اس کا استدلال یہ تھا کہ میں من حیث النوع اس سے افضل ہوں، کیونکہ میں آگ سے پیدا کیا گیا ہوں اور یہ مٹی سے بنایا گیا ہے۔

چہارم یہ کہ جن ایسی مخلوق ہے جو انسان کو دیکھ سکتی ہے مگر انسان اس کو نہیں دیکھ سکتا۔ پنجم یہ کہ مشرکین اپنی جہالت کی بنا پر اس مخلوق کو خدا کا شریک ٹھیراتے اور اس کی پناہ مانگا کرتے تھے۔

کیا اتنی تصریحات کے بعد بھی یہ کہنے کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ محض اَلَمْ یَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ کا خطاب جنوں اور انسانوں کو ایک نوع قرار دینے کے لیے کافی دلیل ہے؟ آخر وہ کونسے دیہاتی یا جنگلی یا پہاڑی انسان ہیں جو اولادِ آدم سے خارج ہیں اور مٹی کے بجائے آگ سے پیدا کیے گئے ہیں جو آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے پائے جاتے تھے؟ جنہیں انسان نہیں دیکھ سکتا اور وہ انسان کو دیکھ سکتے ہیں؟ جنہیں مشرک انسانوں نے کبھی اپنا معبود بنایا ہے اور اللہ کا شریک ٹھیرا کر ان سے تعوذ کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کی بے تکی تاویلیں صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو قرآن کی پیروی کرنے کے بجائے اس سے اپنے خیالات کی پیروی کرانا چاہتے ہیں۔

افکار اسلامی کی اشاعت کے لئے مندرجہ ذیل کتب کا خود بھی مطالعہ کیجئے اور دوسروں کو بھی پڑھائیے

۱۔ اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر | از سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ اسلامی فلسفہ عبادت کی سائنٹفک توضیح و تشریح۔ نماز، روزہ پر علمی انداز میں بحث۔ قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے۔

۲۔ تجدید و احیائے دین | از سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ مجددین کرام کے تجدیدی کارناموں پر ایک نظر۔ تجدید دین کی ضرورت اور اس کے لوازم پر سیر حاصل بحث۔ قسم اعلیٰ مجلد ۲/۵۰ قسم عام ایک روپیہ ۷۵ پیسے۔

۳۔ داعیِ اسلام کی سیاست حکیمہ | از ابو سلیم محمد عبدالحی۔ اس کتاب میں فاضل مصنف نے عام فہم انداز میں حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طریقہ سے پیش کیا ہے کہ پڑھنے والے کے سامنے اس کار عظیم اور اس تحریک کا بھی ایک نقشہ آتا چلا جاتا ہے جس کو پورا کرنے پر آپ مامور تھے۔ قیمت ۲/۵۰ روپے

۴۔ مسلمانوں کے روز و شب | از اسعد گیلانی۔ پاکیزہ زندگی گذارنے کے لیے چوبیس گھنٹوں کا پروگرام قیمت ——— تین روپیہ۔

۵۔ اصلاح معاشرہ دین میں نماز کا مقام | از چوہدری بہاول خان صاحب ناگرہ۔ اپنی ذاتی اور گرد و پیش کی اصلاح کے خواہشمند حضرات کے لیے بہترین گائیڈ۔ ۲۶/۱ روپیہ

۶۔ تفہیم قرآن اور تعلیم بالغان | کے لیے یہ مختصر کتاب نہایت مفید ہے۔ قیمت ۱۰ پیسے۔

۷۔ سنت خیر الانام | از صاحبزادہ پیر کرم شاہ صاحب۔ سلیس عبارت اور دلنشین انداز میں سنت رسول کی حجیت کا ثبوت اور منکرین سنت کے اعتراضات کا جواب۔ ۲/۵۰ روپے۔

ملنے کا پتہ: شعبہ کتب، ادارہ ترجمان القرآن، اچھرہ، لاہور

دُنیا و آخرت کو سنوارنے والا سنہری سِلسلہ

اذکارِ مسنونہ ۔ مُصنّفہ ۔ امام ابن قیّم
مترجمہ : خلیل حامدی

حضرت عُمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا: "مجھے قبولیتِ دُعا کی فکر نہیں، مجھے صرف دُعا کی فکر ہے۔ جب دُعا کی توفیق نصیب ہو گئی تو قبولیت بھی حاصل ہو جائے گی ....." دعا مغزِ عبادت ہے۔ اور "اذکارِ مسنونہ" نبوی دُعاؤں کا مستند ترین مجموعہ ہے جسے ساتویں صدی ہجری کے نامور عالم امام ابن قیّم نے مرتب کیا ہے قیمت قسم اعلیٰ ۳/۷۵ دوم ۲/۵۰

دین کی باتیں ؛ مُصنّفہ: مولانا عبدالحی

ایمان کی تفصیلات کیا ہیں؟ عمل صالح کسے کہتے ہیں؟ ارکانِ اسلام سے مراد کیا ہے؟ اخلاق و حقوق اور سیاسیات میں دین کیا رہنمائی کرتا ہے؟ ان بنیادی امور کا نہایت آسان اور سادہ زبان میں تعارف۔ دیدہ زیب طباعت۔ قیمت ۲ روپے۔

فقہ السنّہ
از محمد عاصم

ایک فقہی انسائیکلوپیڈیا جس میں اسلام کے پانچوں مشہور مذاہب کے فقہی احکام و مسائل کو نہایت مدلّل طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ اردو زبان میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے پہلی جلد کتاب الطہارت اور کتاب الصلوٰۃ پر مشتمل ہے۔ کتابت و طباعت معیاری۔ قیمت ۸ روپے۔

تفسیر سورۂ نُور
از مولانا مودودی

اسلام کے معاشرتی احکام و قوانین کا اچھوتا مجموعہ۔ وکلاء، عدالت، طلبائے قانون، اربابِ قضا اور فلسفۂ اجتماعیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بے نظیر کتاب۔ ہدیہ قسم عام ۲/۷۵، قسم اعلیٰ ۳/۲۵ روپے۔

اسلامک لا اینڈ کانسٹی ٹیوشن ، (انگریزی) از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

اسلامی دستور کی بنیادیں۔ اسلامی ریاست کے خط و خال اور اسلامی ریاست کے دُنیا کے دوسرے نظامہائے ریاست سے ممتاز ہونے کے وجوہ۔ دستوری مسائل کا حل وغیرہ۔ ان تمام امور کی تفصیل آپ کو عہدِ حاضر کی شاہکار کتاب "اسلامک لا اینڈ کانسٹی ٹیوشن" میں ملے گی۔ ضخامت ساڑھے چار سو صفحات قیمت -/۱۲ روپے

ملنے کا پتہ : شعبۂ کتب، ادارۂ ترجمان القرآن ۔ اچھرہ، لاہور

رمضان المبارک کے لیے خصوصی رعایت

- رمضان المبارک نیکیاں کمانے کا مہینہ ہے۔ پاکیزہ کتب کا مطالعہ نیکیاں حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔

رمضان کے مبارک مہینہ میں پاکیزہ کتب کے مطالعہ کا شوق عام طور پر بڑھ جاتا ہے۔ لیکن اس گرانی کے زمانہ میں ایک عام آدمی کے لیے یہ مشکل ہے کہ اپنی روزمرّہ کی ضروریات سے اتنی رقم بچا سکے کہ اپنے ذوقِ مطالعہ کو پورا کر سکے۔ آپ کی ان ہی مشکلات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے آپ کے دینی جذبہ کی تسکین کے لیے ہم نے طے کیا ہے کہ اس ماہ مبارک میں ہم اپنی حسب ذیل ۵۰ کتابیں ۲۰ فیصدی کم قیمت پر دیں گے۔

۱۔ فرمائش کم از کم ۱۵ روپے کی ہو۔

۲۔ محصول ڈاک و پیکنگ بذمہ خریدار ہوگا۔

۳۔ فرمائش میں اشتہار کا حوالہ ضرور دیجیے!

۴۔ یہ رعایتی پیشکش یکم شوال ۱۳۸۱ھ مطابق ۹ مارچ ۱۹۶۲ء تک موصولہ فرمائشوں کے لیے ہے۔

آپ کی سہولت کی خاطر طبع شدہ پوسٹ کارڈ منسلک کیا جا رہا ہے۔ اس پر آپ کو نہ ٹکٹ لگانا ہے اور نہ ہمارا پتہ لکھنا ہے۔ صرف اپنا نام و پتہ اور فرمائش درج کیجیے اور بھیج دیجیے۔

۱۔ رسالہ دینیات	۲/۵۰	۷۔ قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	۲/۲۵
۲۔ خطبات	۴/۲۵	۸۔ تجدید و احیائے دین	۲/۵۰
۳۔ اسلام اور جدید معاشی نظریات	۲/۲۵	۹۔ رسائل و مسائل اوّل	۵/۵۰
۴۔ سُود	۵/۵۰	۱۰۔ " دوم	۷/۰
۵۔ مسئلہ قربانی	۰/۵۰	۱۱۔ تنقیحات	۴/۵۰
۶۔ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی	۴/۵۰	۱۲۔ تفہیمات اوّل ۷/۵۰ دوم	۷/۰

۱۳۔ مرتد کی سزا	۱/۰	۳۲۔ مجموعہ تفاسیر فراہی	۱۲/۰
۱۴۔ مسئلہ قومیت	۱/۵۰	۳۳۔ دعوت اسلامی اور اس کے مطالبات	۲/۵۰
۱۵۔ مسئلہ جبر و قدر	۱/۲۵	۳۴۔ دعوت دین اور اس کا طریق کار	۳/۷۵
۱۶۔ اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر	۱/۵۰	۳۵۔ خطبات مولانا محمد علی جوہر	۲/۵۰
۱۷۔ تفہیمات	۳/۰	۳۶۔ تنقیحات مولانا اصلاحی	۳/۵۰
۱۸۔ پوتے کی وراثت کا مسئلہ	/۳۷	۳۷۔ توضیحات	۳/۵۰
۱۹۔ اسلامی قانون	۱/۰	۳۸۔ تکمیل حج مولانا محمد سلیمان	۳/۰
۲۰۔ اسلامی دستور	۱/۰	۳۹۔ محسن انسانیت اول دوم نعیم صدیقی	۱۴/۰
۲۱۔ اصلاح معاشرہ میں نماز کا مقام	۱/۳۷	۴۰۔ سیاسی کشمکش حصہ سوم	۱۰/۰
۲۲۔ کلمہ طیبہ	/۳۱	۴۱۔ اسلامی ریاست [illegible]	۰/۸۷
۲۳۔ اپنی اصلاح آپ	/۳۱	۴۲۔ " " شہریت کے حقوق	۱/۰
۲۴۔ رمضان کے روز و شب	۳/۰	۴۳۔ " " [illegible]	۰/[illegible]
۲۵۔ بڑی بڑی باتیں	۲/۰	۴۴۔ " " غیر مسلموں کے حقوق	۰/۸۷
۲۶۔ ذکر [illegible]	۲/۷۵	۴۵۔ پاکستانی عورت دوراہے پر	۲/۶۵
۲۷۔ [illegible] طیبہ	۳/۵۰	۴۶۔ اسلامک لا اینڈ کانسٹی ٹیوشن	۱۲/۰
۲۸۔ [illegible]	/۷۵	۴۷۔ [illegible] کی تعمیر	۲/۰
۲۹۔ شرک	۲/۵۰	۴۸۔ [illegible]	۲/۰
۳۰۔ نفاق	۱/۷۵	۴۹۔ اسلام کا نظام معیشت	۰/۶۲
۳۱۔ توبہ	۱/۲۵	۵۰۔ انسانیت کی تعمیر نو	۳/۵۰

حسن پبلک پبلشرز لمیٹڈ ۱۱ سی شاہ عالم مارکیٹ لاہور

ایک اہم رعایتی اعلان

ہماری چند زیرِ طبع کتب

۲۵/- روپے

اِس رعایت سے فائدہ اٹھائیے

۲۰/- روپے

ہم نے اپنی مطبوعات کو زیادہ سے زیادہ ہاتھوں میں پہنچانے اور قارئین کو کم قیمت پر مہیا کرنے کے لیے طے کیا ہے کہ جو حضرات حسب ذیل زیرِ طبع کتب میں سے ۲۵/- روپے کی کتب یکمشت خریدیں گے اور چھپنے سے پہلے اپنے لیے مخصوص کرا لیں گے۔ ان کو ہم یہ کتب ۲۵/- روپے کی بجائے ۲۰/- روپے میں مہیا کریں گے پیکنگ اور ڈاک خرچ بھی ان سے وصول نہیں کیا جائیگا۔ بلکہ کمپنی خود برداشت کرے گی۔

نیا ایڈیشن (ترمیم و اضافہ کے ساتھ)

★ الجہاد فی الاسلام	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی	(مجلد	۱۰٫۵۰	سستا	۷٫۰۰
★ تفہیمات حصہ اوّل	"	"	۷٫۵۰	"	۵٫۵۰
★ پردہ	"	"	۵٫۵۰	"	۳٫۵۰
★ اسلامی نظامِ زندگی		آفسٹ	۹٫۰۰	"	۶٫۰۰
★ اسلامی ریاست			۱۲٫۰۰	"	۸٫۰۰
★ اسلام کا نظامِ حیات	"	"	(بلاک پرنٹنگ)		۱۱٫۰۰

- مخصوص کرانے کے لیے ۲۵ فیصدی رقم پیشگی آنا ضروری ہے۔
- یہ رعایت صرف ۱۵ فروری ۱۹۶۲ء تک موصول شدہ فرمائشوں پر ہوگی۔ اس کے بعد یہ رعایت نہیں دی جائے گی
- فرمائش کے وقت اشتہار کا حوالہ ضرور دیں۔

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، ۱۱-سی شاہ عالم مارکیٹ لاہور

ترجمان القرآن، لاہور

فہرست مضامین

جلد ۵۷	فروری سنہ ۱۹۶۲ء	عدد ۵

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن
اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

اسلامی ریاست

سید ابوالاعلیٰ مودودی

- اسلام کے نظریۂ سیاسی کی مستند تشریح
- اسلام کے نظامِ ریاست کی مکمل تصویر
- اسلامی دستور اور قانون پر سیر حاصل بحث
- پاکستان میں تدوینِ دستور کی تاریخ کا ایک اہم باب
- علماء وطلباءِ قانون وسیاست کے لیے ایک خزینۂ علم
- علمِ سیاست پر ایک عظیم کتاب
- مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے تجرِ علمی کی آئینہ دار

عمدہ کتابت مضبوط جلد ۔ قیمت قسمِ اعلیٰ بارہ روپے ۔ سستا ایڈیشن آٹھ روپے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ
۱۱-ای شاہ عالم مارکیٹ لاہور

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۳۰

جلد ۵۷ عدد ۵

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵- اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور (پاکستان)

سالانہ چندہ ۶ روپے قیمت فی پرچہ ۶۲ پیسے